الرسالہ

ISSN 0970-180X

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

بُرائی کرنا بُرا ہے ۔ مگر بُرائی کرنے والے سے
نفرت کرنا اس سے بھی زیادہ بُرا ہے

اگست ۱۹۸۸
شمارہ ۱۴۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۴۱ — اگست ۱۹۸۸

فہرست

ماہنامہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳، فون: 697333, 611128

عظیم امکان

امریکی میگزین ٹائم (۴ جولائی ۱۹۸۸) کی کور اسٹوری کا موضوع جاپان کی اقتصادی ترقی ہے۔ اس کا عنوان ہے عظیم جاپان Super Japan چار صفحہ کے اس مضمون میں بتایا گیا ہے کہ اقتصادی ترقی کے اعتبار سے اب جاپان کی صدی شروع ہو رہی ہے اور امریکہ کی صدی اب خاتمہ کو پہونچ گئی ہے:

The American century is over (p.4).

مضمون میں مختلف قسم کی تفصیلات دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ بیسویں صدی کے آخر کا سب سے اہم واقعہ جاپان کا سب سے بڑی طاقت (Major superpower) کی حیثیت سے ابھرنا ہے۔ ۱۹۸۸ میں جاپان نے ۱۰ بلین ڈالر بیرونی قرضہ دیا ہے، جب کہ اس کے مقابلہ میں امریکہ کے بیرونی قرضہ کی مقدار ۹ بلین ڈالر ہے۔ آئندہ جاپان ۵۰ بلین ڈالر بیرونی قرضہ دینے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ اس طرح وہ دنیا کا سب سے بڑا معطی ملک بن جائے گا۔

ورلڈ بینک کا صدر ہمیشہ صرف امریکی ہوا کرتا تھا۔ مگر اب جب کہ ورلڈ بینک میں سب سے زیادہ سرمایہ جاپان کا ہے، یہ ناگزیر ہو گیا ہے کہ ورلڈ بینک کا صدر جاپانی ہو۔ پچھلے ۴۰ سال سے امریکہ واحد سب سے بڑی اقتصادی طاقت (Economic superpower) کی حیثیت رکھتا تھا۔ اب یہ حیثیت تیزی سے جاپان کو ملتی جا رہی ہے۔ جاپان اقوام متحدہ کے بجٹ کا گیارہ فی صد حصہ ادا کر رہا ہے جو امریکہ کے بعد نمبر ۲ پر ہے۔ چنانچہ امریکہ اب اس کی حمایت کر رہا ہے کہ جاپان سیکورٹی کونسل کا چھٹا مستقل ممبر بنا دیا جائے۔

تاہم ان ساری ترقیوں کے باوجود جاپان ایک سنگین مسئلہ سے دوچار ہے۔ اس کے سامنے کوئی واضح مقصد (Clear goal) نہیں۔ جاپان کے پاس ڈیموکریسی یا کمیونزم جیسا کوئی قابل برآمد نظریہ (Exportable ideology) نہیں۔ جاپان کی وزارت خارجہ کے ایک سابق افسر ہڈیاکی کاسے (Hideaki Kase) نے کہا کہ ہمارے پاس کچھ آدرش ہونا چاہیے جس میں عالم انسانی کے لیے اپیل ہو:

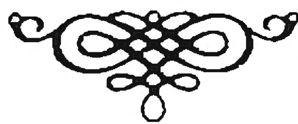
There must be some ideal that we have that would appeal to mankind (p.5).

مسلمانوں کے نزدیک اب تک " جاپان " کا تصور صرف یہ ہے کہ وہ جاپان کا الکٹرانک سامان اور جاپان کی نئی ماڈل کی کار خریدیں اور اس پر فخر کریں۔ حالاں کہ جاپان میں ان کے لیے اس سے کہیں زیادہ بڑا امکان چھپا ہوا ہے۔ اب تک وہ جاپان سے صرف " لینے والے " بنے ہوئے تھے، مگر نئے حالات بتاتے ہیں کہ وہ جاپان کے لیے " دینے والے " بن سکتے ہیں۔

مسلمانوں کے پاس اسلام ہے۔ جو محفوظ دین ہے۔ اس کی تاریخ نے اس کو ایک مسلمہ حقیقت کی حیثیت دے دی ہے۔ جس خدا نے انسان کو بنایا ہے، اسی خدا نے اس دین کو بھی وضع کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ تمام انسانی تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام عین وہی چیز ہے جس کو جاپان اور دوسری قومیں تلاش کر رہی ہیں ـــــــ صحیح ترین آئیڈیل جو کسی انسان کو حقیقی تسکین دے، اور جس کے اوپر کوئی قوم حقیقی طور پر کھڑی ہو سکے۔

آج مسلمانوں کے کرنے کا سب سے بڑا کام یہی ہے کہ وہ اسلام کی ربانی دعوت کو لے کر اٹھیں اور اس کو جاپانیوں اور دوسری قوموں کے سامنے پیش کریں۔ موجودہ زمانہ میں اگر کوئی افرض الفرائض ہے تو بلاشبہ وہ یہی دعوت ہے۔ مسلمان اگر اس کے لیے اٹھیں تو وہ اپنے لیے ایک عظیم کام پا لیں گے۔ دوسروں تک ایک عظیم خدائی تحفہ پہونچانے کا سبب بنیں گے۔

آج کی دنیا میں دعوتِ اسلامی کے جو عظیم امکانات پیدا ہوئے ہیں، ان کو جاننا اور انھیں استعمال کرنا بلاشبہ مسلمانوں کے لیے سب سے بڑا فریضہ ہے۔ اگر مسلمان ان مواقع کو استعمال کریں تو وہ دنیا و آخرت میں سب سے بڑی سرخروئی حاصل کریں گے۔ اور اگر وہ ان مواقع کو استعمال نہ کریں تو بلاشبہ یہ سب سے بڑا جرم ہے۔ اس کے بعد شدید اندیشہ ہے کہ وہ غضب الٰہی کے مستحق ہو جائیں، اور پھر کوئی بھی چیز نہ ہو جو انھیں اللہ کی پکڑ سے بچا سکے۔



جوابی غلطی نہیں

جمعہ کی نماز سے پہلے جو خطبہ دیا جاتا ہے، اس کا مقصد تذکیر و نصیحت ہے۔ اسی لیے حکم ہے کہ خطبہ کے وقت خاموش رہو اور اس کو غور سے سنو۔ اس سلسلہ میں شریعت میں جو احکام دیے گئے ہیں، ان میں سے ایک حکم وہ ہے جو ابو ہریرہؓ کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے جو بخاری و مسلم میں نقل ہوئی ہے:

قال رسول الله صلی الله علیه وسلم۔ اذا قلتَ لصاحبكَ يوم الجمعة انصِت والامام يخطبُ فقد لغوتَ (متفق علیہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم اپنے ساتھی سے جمعہ کے دن کہو کہ چپ رہو، جب کہ امام خطبہ دے رہا ہو تو تم نے لغو کام کیا۔

بظاہر اصل غلطی کرنے والا وہ ہے جو خطبہ کے وقت ابتداءً بولے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لغو فعل کا مرتکب اس کو قرار دیا جس نے دوسری بار بول کر اس کو چپ کرانے کی کوشش کی۔ کیوں کہ اصل مطلوب تو خاموشی تھی، اور جب دوسرا شخص چپ کرانے کے لیے بول پڑا تو اس نے ایک غلطی کو دو غلطی کر دیا۔ ایسی حالت میں اس کو اشارہ سے چپ کرانا چاہیے نہ کہ بول کر۔

اس حدیث سے اجتماعی زندگی کا ایک اصول معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اجتماعی زندگی میں وہ شخص زیادہ بڑا غلط کار ہے جو ایک غلطی کے بعد دوسری غلطی کرے۔ اگر ایک شخص کوئی قابل اعتراض کارروائی کرتا ہے تو دوسروں کو چاہیے کہ اس سے اعراض کریں یا حکمت کے ساتھ اس کو دفع کرنے کی کوشش کریں۔ دوسرے لوگ اگر ایسا کریں تو غلطی پہلے ہی مرحلہ میں دب کر ختم ہو جائے گی۔ لیکن اگر دوسرے لوگ بے صبری میں آکر اس کے خلاف جوابی کارروائی کرنے لگیں تو غلطی کا دائرہ بڑھے گا۔ وہ انفرادی نقصان سے آگے بڑھ کر اجتماعی نقصان تک پہونچ جائے گا۔

جو شخص "جوابی غلطی" کرے وہ زیادہ بڑا غلط کار ہے۔ کیوں کہ جہاں اس کو حکمت اور اعراض سے کام لینا چاہیے تھا، وہاں اس نے بدتدبیری اور بے صبری کا مظاہرہ کیا، اور اس طرح غلطی کو کئی گنا زیادہ بڑھا دیا۔ پہلا طریقہ غلطی کو دیکھ کر اس پر مشتعل ہونے کی مثال ہے، دوسرا طریقہ غلطی کو دیکھ کر اس کی اصلاح کرنے کی مثال۔

دعوتی عمل

کسی اجتماعی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے منظم عمل لازمی طور پر ضروری ہے۔ جب بھی ایک شخص کوئی اجتماعی نشانہ تجویز کرتا ہے تو اپنے مزاج کے مطابق، اپنی مطلوبہ منزل تک پہونچنے کے لیے وہ ایک عمل بھی ضرور مقرر کرتا ہے۔ اس عمل کی مختلف صورتیں ہیں۔

عمل کی ایک صورت وہ ہے جس کو متشددانہ عمل (Violent activism) کہا جاتا ہے۔ ماضی اور حال کی تاریخ میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں۔ اس کی ایک تازہ اور قریبی مثال آزاد سکھ ریاست (خالصتان) کے حامیوں کی ہے۔ ۸۸-۱۹۸۷ میں انھوں نے پنجاب میں اسی کے مطابق عمل کیا، اگرچہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔

عمل کی دوسری صورت وہ ہے جس کو غیر متشددانہ عمل (Non-violent activism) کہا جاتا ہے۔ اس میں ہتھیار استعمال کیے بغیر عوامی مظاہرہ اور عوامی ایجی ٹیشن کے ذریعہ فریق ثانی پر دباؤ ڈالا جاتا ہے تاکہ وہ فریق اول کے مطالبات کو مان لے۔ مہاتما گاندھی نے ۱۹۴۷ سے پہلے انگریزوں کے خلاف اسی طریقہ کو استعمال کیا، اور کامیابی حاصل کی۔

عمل کی تیسری صورت وہ ہے جس کو سیاسی عمل (Political activism) کہا جاسکتا ہے۔ اس کی ایک واضح مثال الکشنی سیاست ہے۔ الکشن کے موقع پر مخالف پارٹیاں اسی طریقہ کو استعمال کرکے حکمراں پارٹی کو گراتی ہیں۔ اور حکومت کے ایوان پر قبضہ حاصل کرتی ہیں۔

عمل کے ان طریقوں میں سے کوئی بھی طریقہ اسلام کے مزاج کے مطابق نہیں۔ اسلام کا طریقِ عمل جو قرآن وسنت سے معلوم ہوتا ہے وہ دعوت ہے۔ آج کل کی زبان میں اس کو دعوتی عمل (Dawah activism) کہا جاسکتا ہے۔ اس طریقہ میں سارا انحصار سنجیدہ ذرائع پر کیا جاتا ہے ــــ منوانے کے بجائے متاثر کرنا۔ ہرانے کے بجائے دل جیتنا۔ حریف اور رقیب بننے کے بجائے ہمدرد اور ناصح بن کر سامنے آنا۔ فریق ثانی سے نفرت کرنے کے بجائے اس سے محبت کرنا، یہاں تک کہ اس کے حق میں دعائیں نکلنے لگیں۔

یہ دعوتی عمل ہی صحیح اسلامی عمل ہے۔ یہی واحد طریقہ ہے جس کو اختیار کرکے مسلمان کامیاب ہو سکتے ہیں، موجودہ دنیا میں بھی اور آئندہ آنے والی ابدی جنتوں کی دنیا میں بھی۔

اسوۂ ابراہیمی

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ صبر اور اعراض کو کمتر درجہ کی چیز سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ مجاہدانہ جوش کے تحت فوراً میدان مقابلہ میں کود پڑے۔ اس قسم کے اقدام کو وہ اسوۂ ابراہیمی قرار دیتے ہیں۔ اگر ان سے پوچھئے کہ اس جہاد یا اسوۂ ابراہیمی کا ماخذ کیا ہے تو وہ فوراً اقبال کا یہ شعر پڑھ دیں گے:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق　　عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ شاعر کی خود ساختہ خیال آرائی ہے نہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اسوہ۔ اس شعر میں حضرت ابراہیم کی جو تصویر پیش کی گئی ہے وہ سراسر خلافِ واقعہ ہے۔ اس کا تعلق نہ قرآن و حدیث سے ہے اور نہ تاریخ سے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ ابراہیم بن آزر علیہ الصلوٰۃ والسلام عراق میں پیدا ہوئے۔ اس وقت وہاں مکمل طور پر شرک کا غلبہ تھا۔ آپ نے ان کو توحید کی طرف بلایا۔ اور اپنی طرف سے کسی بھی قسم کا ٹکراؤ پیدا کیے بغیر خالص پرامن انداز میں اس کی دعوت دیتے رہے۔ قوم کے سردار جو بت پرستی کے اوپر اپنی سرداری قائم کیے ہوئے تھے، وہ آپ کے دشمن ہو گئے۔ انھوں نے آپس میں مشورہ کر کے یہ طے کیا کہ آپ کو جلا کر ختم کر دیں (قالوا حرقوہ، الانبیاء ۶۸)

روایات بتاتی ہیں کہ اس کے بعد انھوں نے ایک گڑھا کھودا۔ اس گڑھے میں لکڑیاں ڈال کر اس میں آگ لگا دی۔ جب آگ خوب بھڑکنے لگی، اس وقت انھوں نے حضرت ابراہیم کو پکڑ کر انھیں باندھا، باندھ کر ان کو منجنیق میں رکھا۔ اور منجنیق کے ذریعہ آپ کو آگ میں پھینک دیا (ثم اوثقوا ابراهيم وجعلوه في منجنيق ورموه في النار، صفوة التفاسير، المجلد الثاني، صفحه ۲۶۸)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ آگ میں ڈالے گئے تھے نہ کہ آگ میں کود پڑے تھے۔ یہ جبر کا معاملہ تھا نہ کہ اختیار کا۔ مذکورہ شعر حضرت ابراہیم کی جو تصویر پیش کرتا ہے وہ نہ صرف خلاف واقعہ ہے بلکہ خلاف اسلام بھی ہے۔ یہ ہرگز اسلام یا پیغمبروں کا اسوہ نہیں کہ آدمی بے خطر آگ میں کود پڑے۔ پیغمبروں کا اسوہ لوگوں کو آگ سے نکالنے کی کوشش کرنا ہے نہ کہ خواہ مخواہ آگ میں کود پڑنا۔

سچّی ہمدردی

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے امریکہ میں سائنس کی تعلیم حاصل کی ہے اور اب وہیں ایک تعلیمی ادارہ میں کام کرتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ امریکہ میں آپ کی ملاقات کیا کچھ یہودیوں سے ہوئی۔ انھوں نے کہا ہاں۔ خود ہمارے ادارہ میں کئی یہودی کام کر رہے ہیں۔ ہمارا ڈائرکٹر بھی یہودی ہے۔

میں نے پوچھا کہ کہا جاتا ہے کہ یہودی امریکہ میں بہت کامیاب ہیں جب کہ وہ وہاں کی بہت چھوٹی اقلیت ہیں۔ ان کی اس غیر معمولی کامیابی کا راز کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ایک لفظ میں اس کا راز امتیاز (Excellence) ہے۔ انھوں نے امتیازی لیاقت کو اپنا نشانہ بنایا ہے، اور جب امتیازی لیاقت کا درجہ آجائے تو کوئی بھی آپ کی کامیابی کو روک نہیں سکتا۔

انھوں نے مزید کہا کہ امریکہ میں یہودیوں نے جو تعلیمی ادارے قائم کیے ہیں، ان میں انھوں نے بڑا عجیب اصول رائج کیا ہے۔ ان کے تعلیمی اداروں میں غیر یہودی طالب علموں کو اسکالرشپ کا مستحق بننے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ امتحان میں ۶۰ فی صد نمبر حاصل کریں۔ مگر یہودیوں کے لیے ان کا معیار بے حد سخت ہے۔ یہودی طالب علموں کو اسکالرشپ حاصل کرنے کے لیے ۹۵ فی صد نمبر لانا ضروری ہے۔ اگر ان کے نمبر ۹۵ فی صد سے کم ہوں تو ان کو اسکالرشپ (وظیفہ) نہیں دیا جائے گا۔

یہودی خود اپنے اداروں میں ایسا کیوں کرتے ہیں۔ ان کا یہ عمل بظاہر سختی معلوم ہوتا ہے۔ مگر وہ سختی نہیں بلکہ سب سے بڑی ہمدردی ہے۔ اس طرح وہ اپنے نوجوانوں میں محنت کا جذبہ ابھارتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے نوجوانوں میں یہ حوصلہ پیدا کرتے ہیں کہ وہ دوسروں کو پیچھے چھوڑ کر ان سے آگے نکل جائیں۔

موجودہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے۔ یہاں جو لوگ رعایت کے طالب ہوں ان کو صرف پچھلی سیٹوں پر جگہ ملتی ہے، اور جو لوگ امتیازی لیاقت کا ثبوت دیں وہ اگلی سیٹوں پر جگہ پانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

ذمّہ دار کون

ہندستان میں ہولی کے دن ایک ہندو کچھ مسلمانوں کے اوپر رنگ ڈال دیتا ہے۔ مسلمان مشتعل ہو کر لڑنے لگتے ہیں۔ اور پھر ساری بستی میں فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑتا ہے۔ پاکستان کے ایک ہوٹل میں کسی مسئلہ پر تکرار ہوتی ہے۔ ایک پٹھان کچھ مہاجرین کے اوپر گرم چائے کی پیالی پھینک دیتا ہے۔ یہ مہاجرین مشتعل ہو کر لڑ پڑتے ہیں۔ اور اس کے بعد پورے شہر میں مہاجر مسلمان اور پٹھان مسلمان کے درمیان جنگ شروع ہو جاتی ہے۔

ان واقعات میں بظاہر فساد کا آغاز کرنے والا ہندستان میں ہندو اور پاکستان میں پٹھان ہے۔ مگر قرآن کی رو سے دیکھئے تو دونوں جگہ فساد کی اصل ذمہ داری فریق ثانی پر عائد ہوتی ہے۔ ہندستان میں مسلمان کے اوپر اور پاکستان میں مہاجر کے اوپر۔ کیوں کہ دونوں جگہ فریق ثانی نے یہ کیا کہ فریق اول کے جس واقعہ پر قرآن میں عفو و درگزر کا حکم دیا تھا۔ اس کو انھوں نے انتقام اور جوابی کارروائی کا عنوان بنایا۔

موجودہ دنیا دارالامتحان ہے۔ یہاں ہر شخص کو آزادی حاصل ہے۔ اس لیے مذکورہ نوعیت کے چھوٹے چھوٹے واقعات ہر جگہ لازماً پیش آئیں گے، خواہ وہ مسلم ملک ہو یا غیر مسلم ملک۔ یہ اس تخلیقی منصوبہ کا فطری نتیجہ ہے جس کے تحت اللہ تعالیٰ نے موجودہ دنیا کو بنایا ہے۔ اسی لیے یہ حکم دیا گیا ہے کہ اس طرح کے واقعات کو اعراض کے خانہ میں ڈال دو۔ اس کو اشتعال اور انتقام کا مسئلہ نہ بناؤ ——— اب جو شخص ایسا نہ کرے وہ بلاشبہہ مفسد ہے۔ کیوں کہ وہ خدا کے نظام تخلیق پر راضی نہیں ہوا۔

ہندستان اور پاکستان میں جو لوگ عفو و درگذر کے اصول کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے، وہی لوگ "پٹرو ڈالر" کے ملکوں میں جا کر مبالغہ کی حد تک عفو و درگذر کے اصول کی پابندی کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی نظر میں قرآن کے حکم کی اتنی اہمیت نہیں جتنی اہمیت پٹرو ڈالر کے حکم کی ہے۔ اس سے زیادہ عجیب بات ہے کہ اس کے باوجود یہ لوگ اپنے آپ کو قرآن کا مومن کامل سمجھتے ہیں۔

یہ صحیح نہیں

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) نے اپنے مقالہ کروسیڈ (Crusades) کے تحت لکھا ہے کہ تیرہویں صدی عیسوی میں مسیحی مبلغین مشرق کے مسلم ممالک میں داخل ہوئے۔ تاہم وہ مسلمانوں کو عیسائی بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اسلامی قانون چوں کہ نہایت سختی کے ساتھ غیر مذاہب کی تبلیغ کو ممنوع قرار دیتا ہے اور اسلام سے پھر جانے والے کے لیے اس کے یہاں موت کی سزا ہے، اس لیے اسلام کو چھوڑ کر مسیحیت اختیار کرنے والوں کی تعداد بہت کم رہی:

Since Islamic law rigidly prohibited propaganda and punished apostasy with death, conversion from Islam were few (5/310).

یہ صحیح ہے کہ اسلامی دور میں غیر مذاہب کی تبلیغ موثر انداز میں جاری نہ رہ سکی۔ مگر اس کی وجہ قانونی ممانعت نہ تھی۔ اس کی وجہ تمام تر وہی تھی جو موجودہ زمانہ میں ہم نسلی بادشاہت کے معاملہ میں دیکھ رہے ہیں۔ موجودہ آزاد ممالک (مثلاً ہندستان یا فرانس میں) نسلی بادشاہت کے نظریہ کی تبلیغ پر کوئی قانونی پابندی نہیں۔ اس کے باوجود ان ملکوں میں نسلی بادشاہت کے نظریہ کی تبلیغ نہیں ہو رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جمہوریت کے فکری انقلاب نے نسلی بادشاہت کے نظریہ کو بے بنیاد ثابت کر دیا ہے۔ نسلی بادشاہت علمی طور پر اب اس قابل نہیں کہ کوئی اس کا مبلغ بن سکے۔

اسی طرح مسلمانوں کے عیسائی نہ ہونے کا کوئی تعلق اسلام کے قانونِ ارتداد سے نہیں ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ برطانیہ نے اپنے دورِ اقتدار میں اس قسم کے اندیشہ کو مکمل طور پر ختم کر دیا۔ مگر سابقہ صورت حال میں کوئی فرق نہیں آیا۔ آج بھی تقریباً تمام دنیا میں مسلمانوں کے لیے عملاً ارتداد کا راستہ کھلا ہوا ہے، مگر مسلمانوں کے مقابلہ میں مسیحی مبلغین کو کہیں بھی کوئی قابلِ ذکر کامیابی حاصل نہیں۔

اصل یہ ہے کہ اسلام کی صداقت وہ چیز ہے جو مسلمانوں کے اوپر دوسرے مذاہب کی تبلیغ کو غیر موثر بنا رہی ہے۔ اس کا تعلق اسلام کی نظریاتی طاقت سے ہے نہ کہ تبلیغ کی قانونی ممانعت سے۔

عبرت ناک

عراق - ایران جنگ کو اب تقریباً آٹھ سال پورے ہو رہے ہیں۔ اس تباہ کن جنگ کی خبریں اخبارات میں آتی رہتی ہیں۔ امریکی میگزین ٹائم (۴ اپریل ۱۹۸۸) نے اپنے صفحہ ۱۱ پر بعض تصویریں چھاپی ہیں۔ اس تصویر میں ایک کُرد علاقہ کو دکھایا گیا ہے جہاں ایک وحشیانہ بمباری کے نتیجہ میں عورت اور مرد اور بچے انتہائی بے کسی کی حالت میں مرے ہوئے پڑے ہیں۔

اس رپورٹ کو پڑھنے کے بعد ایک اسرائیلی شہری کیرول ڈیزنٹ (Carol Dezent) نے ٹائم کو ایک خط لکھا ہے جو اس کے شمارہ ۹ مئی ۱۹۸۸ میں چھپا ہے۔ کیرول ڈیزنٹ نے اپنے خط میں کہا ہے کہ میں نے اس سے پہلے اس قدر ہولناک جنگی تصویریں نہیں دیکھیں۔ اگر دنیا اسرائیل کی حالیہ کارروائیوں کو اتنا غیر منصفانہ سمجھتی ہے تو معصوموں کے اس اجتماعی قتل کے خلاف اس کی چیخ پکار کہاں ہے :

If the world deems Israel's recent actions so unjust, where is the thunders outcry against this mass killing of innocents?

اس میں شک نہیں کہ عراق - ایران جنگ میں خود مسلمانوں کے ہاتھ سے مسلمان جس طرح مارے جا رہے ہیں وہ وحشت اور بربریت میں اپنی مثال نہیں رکھتی۔ مگر یہ صرف عراق اور ایران کا مسئلہ نہیں۔ یہی تمام مسلم دنیا کا مسئلہ ہے۔ آج مسلمان کو مسلمان کے ہاتھ سے جو نقصان پہونچ رہا ہے وہ اس سے بہت زیادہ ہے جو کافروں اور مشرکوں کے ذریعہ انھیں پہونچ رہا ہے۔ ہندستان کے فرقہ وارانہ فسادات میں "ہندوؤں" کے ہاتھ سے مسلمانوں کو جو نقصان پہونچتا ہے اس سے ہزاروں گنا زیادہ نقصان خود مسلمان اپنے بھائیوں کو پہونچا رہے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ یہاں مسلمان دوسرے مسلمان کا ایک مکان ہڑپ کرتا ہے تو ایران اور عراق میں پوری پوری بستی کو بم سے اڑا دیا جاتا ہے۔ یہاں لوگوں کے بس میں کردار کشی ہے تو وہ کردار کشی کر رہے ہیں۔ وہاں کے حکمراں جسم کشی پر قادر ہیں، اس لیے وہ بمباری کرکے جسم کے چیتھڑے اڑا رہے ہیں۔

کمی یہاں ہے

نیتاجی سبھاش چندر بوس نے ۱۹۴۳ میں آزاد ہند فوج (Indian National Army) بنائی تھی۔ اس کا مقصد انگریزوں سے لڑکر ہندستان کو آزاد کرانا تھا۔ یہ فوج رنگون میں بنائی گئی۔ مگر قبل اس کے کہ وہ ہندستان میں داخل ہو انگریزی فوج کے برمی دستہ نے اسے ختم کر دیا۔

آزاد ہند فوج کے تین خاص کمانڈر تھے ۔ ڈھلوں، سہگل اور شاہ نواز۔ ان لوگوں پر لال قلعہ کی ایک عدالت میں غداری کا مقدمہ چلایا گیا جس کی وکالت مدّعیٰ علیہ کی طرف سے جواہر لال نہرو نے کی تھی۔ اسی زمانہ میں ایک شاعر کا یہ شعر بہت مشہور ہوا تھا:

لال قلعہ سے آئی آواز ڈھلوں، سہگل، شاہ نواز

کرنل گوربخش سنگھ ڈھلوں (عمر ۷۵ سال) اب شیوپوری (مدھیہ پردیش) میں رہتے ہیں۔ اور کبھی کبھی دہلی آتے ہیں۔ پرومیلا کلہن نے ان سے ایک انٹرویو لیا جو ہندستان ٹائمس (۱۶ مئی ۱۹۸۸) میں چھپا ہے۔ اس انٹرویو میں انھوں نے جو باتیں بتائیں ان میں سے ایک بات مطبوعہ انٹرویو کے مطابق یہ تھی کہ ہندستانیوں اور ایشیائیوں نے فیاضانہ طور پر نیتاجی سبھاش چندر بوس کی مالی مدد کی۔ رنگون کے ایک مسلمان تاجر نے تنہا ان کو ایک کرور روپیہ دیا:

A cosmetic manufacturer, a Muslim in Rangoon, gave a crore of rupees (p.10).

۱۹۴۴ کا ایک کرور روپیہ آج کے لحاظ سے ۵۰ کرور روپیہ سے بھی زیادہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے سیاسی اور قومی کاموں میں بہت بڑا بڑا تعاون دیا ہے۔ اور بے شمار سرمایہ خرچ کیا ہے۔ مگر دورِ جدید کی پوری تاریخ میں کوئی ایک مثال نہیں جب کہ مسلمانوں نے دعوت الی اللہ کے کام میں کوئی بڑا تعاون کیا ہو۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ نفرتِ اقوام کے لیے اٹھے مگر وہ محبتِ اقوام کے لیے نہ اٹھ سکے۔ یہی واحد سب سے بڑا سبب ہے جس نے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے سارے معاملات کو برباد کر رکھا ہے۔ جب تک وہ اپنے اس مزاج کو نہ بدلیں، کسی بھی دوسری تدبیر سے ان کے حالات بدلنے والے نہیں۔

قرآن وسنت کی رہنمائی

اسلام کے نزدیک تمام مسجدیں یکساں ہیں، خواہ کوئی چھوٹی مسجد ہو یا کوئی بڑی مسجد، خواہ وہ کسی معمولی آدمی کی بنوائی ہوئی ہو یا کسی بادشاہ کی بنوائی ہوئی۔ اس میں صرف تین مسجدوں کا استثناء ہے۔ بخاری ومسلم نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صرف تین مسجدیں ہیں جن کے لیے سفر کرنا درست ہے۔ مکہ کی مسجد حرام، مدینہ کی مسجد نبوی، اور فلسطین کی مسجد اقصیٰ (لا تشد الرحال الا الی ثلاثة مساجد: المسجد الحرام، ومسجد الرسول، ومسجد الاقصیٰ۔ وفی روایة: انما یسافر الی ثلاثة مساجد۔ مسجد الکعبة ومسجدی ومسجد ایلیاء)

اس حدیث کی تشریح محدثین نے یہ کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کے تقرب کی نیت سے کسی مقام کا قصد نہیں کیا جائے گا، سوا ان تین مقامات کے، ان کی عظمت اور شرف کی وجہ سے (المراد لا یقصد موضع من المواضع بنیة العبادة والتقرب الی اللہ تعالی الا الی ھذہ الاماکن الثلاثة تعظیما لشانھا وتشریفاً)

معلوم ہوا کہ مذکورہ تین مسجدوں کے علاوہ کسی اور مسجد کے لیے اسلام میں شدِّ رحال کی اجازت نہیں ہے۔ یہ امتیازی حیثیت صرف تین مسجدوں کو حاصل ہے کہ خاص اس میں عبادت کرنے کے مقصد سے آدمی وہاں کا سفر اختیار کر سکتا ہے۔ دوسری تمام مسجدوں میں عبادت کا ثواب یکساں ہے، جیسا ایک مسجد میں ویسا ہی دوسری مسجد میں۔ البتہ مذکورہ تین مسجدوں میں عبادت کا ثواب استثنائی طور پر زیادہ ہے۔ ان تین مسجدوں کے سوا کسی اور مسجد کی نہ کوئی امتیازی حیثیت ہے اور نہ ان کے علاوہ کسی اور مسجد کے لیے خصوصی طور پر عبادتی سفر کرنا جائز ہے۔

مذکورہ شرعی حکم "عبادتی سفر" کے لیے ہے۔ اب اگر کچھ مسلمان ایک عام مسجد کی طرف کفن بردوش ہو کر سفر کریں۔ وہ کہیں کہ ہم جو مارچ کر رہے ہیں وہ عبادتی مارچ نہیں ہے۔ ہم تو مسجد کے غاصبوں سے مسجد کو واگذار کرنے کے لیے ان کے اوپر پرامن جمہوری چڑھائی کر رہے ہیں، تو یہ اور بھی زیادہ غلط ہوگا۔ کیوں کہ ایک مسجد کے لیے عبادتی شدِّ رحال اگر بدعت ہو، تو غیر مسلح

مسلمانوں کا اس کے مسلح غاصبوں سے ٹکرانے کے لیے اقدام کرنا سراسر حرام ہے ۔

اگر نارمل حالات ہوں اور سفر کے ساتھ جان و مال کے نقصان کا اندیشہ وابستہ نہ ہو تب بھی تین مسجدوں کے سوا کسی مسجد کے لیے شد رحال جائز نہیں۔ لیکن اگر غیر معمولی حالات ہوں اور سفر کرکے مسجد تک پہونچنے میں مسلمانوں کی جان و مال کا خطرہ پیدا ہو گیا ہو تو اس وقت معاملہ مزید نازک ہو جاتا ہے ۔ ایسی حالت میں فضیلت والی مسجدوں کے لیے سفر کرنا بھی غیر مطلوب بن جائے گا، اور دوسری مسجدوں کی طرف پرخطر مارچ کرنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں ۔

جہاں تک اس دوسرے معاملہ کی نوعیت کا سوال ہے ، اس کی مثال ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ملتی ہے ۔ ۶ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تقریباً ڈیڑھ ہزار اصحاب کے ساتھ مدینہ سے مکہ کے لیے روانہ ہوئے تاکہ وہاں پہونچ کر عمرہ ادا کریں۔ آج کل کی زبان میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے مکہ کی طرف پر امن مارچ کیا ۔ یہ مقدس قافلہ مکہ کے قریب حدیبیہ کے مقام تک پہونچا تھا کہ مکہ کے منکرین نے آپ کو آگے بڑھنے سے روکا ۔ وہ آپ سے لڑنے کے لیے تیار ہو گیے ۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کی سواری حدیبیہ کے مقام پر روک دی (حبسہا حابس الفیل) اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ سے اعراض فرمایا اور قریش کی شرط کے مطابق، عمرہ ادا کیے بغیر درمیان ہی سے مدینہ کی طرف واپس چلے گیے ۔

قدیم عرب میں "غیر تحریری دستور" یہ تھا کہ کسی کو زیارت کعبہ سے روکا نہ جائے ۔ مگر قریش اس کی کھلی خلاف ورزی کرتے ہوئے آپ کو زیارتِ کعبہ سے روکنے پر تل گیے ۔ اب ایک طرف صورتِ دستوری تھی جو آپ کے موافق تھی اور دوسری طرف صورتِ واقعی تھی جو آپ کے خلاف ہو گئی تھی۔ آپ نے صورتِ دستوری کا کوئی حوالہ نہیں دیا بلکہ صورتِ واقعی کو اصل سمجھتے ہوئے اس کے مطابق عمل فرمایا ــــــــ پیغمبرانہ حکمت حقیقتِ واقعہ کو اپنے موافق بنانا ہے نہ کہ " دستور" کے نام پر بے فائدہ لفظی جنگ لڑنا ۔

جس وقت مذکورہ واقعہ پیش آیا اس وقت حرم کعبہ میں ۳۶۰ بُت رکھے ہوئے تھے ۔ مگر اللہ تعالیٰ نے رسول اور اصحاب رسول کو یہ حکم نہیں دیا کہ تم توحید کے گھر کو بتوں سے پاک کرنے کے لیے ہر قیمت پر مکہ میں داخل ہو جاؤ ۔ اگر اس وقت تم خاموش ہو گیے تو کافروں کے حوصلے

بڑھ جائیں گے۔ اس کے بعد وہ دوسری تمام مسجدوں کو بھی اپنے قبضہ میں لینے کی کوشش کریں گے اور ان کو اپنے بتوں سے بھر دیں گے۔ اس نازک موقع پر اس قسم کا "مجاہدانہ" حکم نہ آنا ثابت کرتا ہے کہ اس قسم کی مصلحت اللہ تعالیٰ کی نظر میں غیر معتبر ہے۔ وہ کوئی حقیقی اور معتبر مصلحت نہیں، اس لیے مسلمانوں کو ایسی مصلحتوں کا لحاظ کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔

مکہ کی طرف مارچ سے روکنے کی حکمت کیا تھی، وہ واضح طور پر قرآن کی ۴۸ ویں سورۃ الفتح میں بیان کی گئی ہے۔ متعلقہ آیتوں کا ترجمہ یہ ہے:

اور اللہ ہی ہے جس نے ان کے ہاتھوں کو تم سے روک دیا اور تمہارے ہاتھوں کو ان سے روک دیا، مکہ کی وادی میں۔ بعد اس کے کہ تم کو ان پر قابو دیدیا تھا۔ اور اللہ دیکھ رہا تھا جو کچھ تم کر رہے تھے۔ وہی ہیں جنھوں نے انکار کیا اور تم کو مسجد حرام سے روکا اور قربانی کے جانوروں کو بھی کہ وہ اپنی جگہ تک نہ پہونچیں۔ اور اگر ایسے مومن مرد اور مومن عورتیں نہ ہوتیں جن کو تم لاعلمی میں روند ڈالتے، پھر ان کے باعث تم پر بے خبری میں الزام آتا (تو ہم جنگ کی اجازت دیدیتے) تاکہ اللہ جس کو چاہے اپنی رحمت میں داخل کرے۔ اور اگر وہ لوگ الگ ہو گیے ہوتے تو ان میں جو منکر تھے، ان کو ہم دردناک سزا دیتے (الفتح ۲۴-۲۵)

مولانا شبیر احمد عثمانی سورہ فتح کی مذکورہ آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "یعنی ان کی شرارتیں اور تمہارا عفو و تحمل سب کچھ اللہ دیکھ رہا ہے ---- کچھ مسلمان مرد و عورت جو مکہ میں مظلوم و مقہور تھے اور مسلمان ان کو پوری طرح جانتے نہ تھے، وہ لڑائی میں بے خبری سے پیس دیئے جائیں گے۔ اگر یہ خطرہ نہ ہوتا تو فی الحال لڑائی کا (اور مکہ میں داخلہ کا) حکم دیدیا جاتا۔ لیکن ایسا ہوتا تو تم خود (مسلمانوں کی ہلاکت کے) اس قومی نقصان پر متأسف ہوتے۔ اس خرابی کے باعث لڑائی (اور مکہ میں داخلہ) موقوف رکھا گیا تاکہ وہ مسلمان محفوظ رہیں اور تم پر اس بے مثال صبر و تحمل کی بدولت خدا اپنی رحمت نازل فرمائے۔ نیز کافروں میں سے جن لوگوں کا اسلام لانا مقدر ہے، ان کو بھی لڑائی کی خطرناک گڑبڑ سے بچا کر اپنی رحمت میں داخل کرے" صفحہ ۶۶۷

حدیبیہ (۶ھ) کا واقعہ اور اس کے بارے میں قرآن کا مذکورہ ارشاد بتا رہا ہے کہ مسجد حرام میں بتوں کی موجودگی اور اس پر کافروں کے ناجائز قبضہ کے باوجود، اللہ تعالیٰ نے

اس کی طرف " مارچ " کرنے کا حکم نہیں دیا۔ مذکورہ آیت میں اس کی دو خاص وجہ بتائی گئی ہے۔

۱۔ مکہ کی طرف عمرہ کی ادائیگی کے لیے " مارچ " کرنا اگرچہ بظاہر ایک سادہ واقعہ تھا مگر اس وقت اہل مکہ کے درمیان اشتعال کی جو فضا عملاً بن گئی تھی، اس کو دیکھتے ہوئے یہ یقینی تھا کہ " مارچ " کو جاری رکھنے میں مسلمانوں کا اہل مکہ سے غیر ضروری ٹکراؤ ہوگا اور اس کے نتیجہ میں بہت سے بے قصور مسلمان ناحق مارے جائیں گے۔ مسلمان کا خون بے حد قیمتی ہے۔ اس کو بچانا ہر دوسری مصلحت پر فوقیت رکھتا ہے۔

۲۔ ٹکراؤ سے بچنے کی دوسری مصلحت یہ بتائی کہ جن لوگوں سے تمہارا جنگی ٹکراؤ ہوتا وہ اگرچہ بظاہر تمہارے اور اسلام کے دشمن تھے مگر ان میں بہت سے ایسے افراد تھے جن کے اندر قبولیت حق کی فطری استعداد موجود تھی۔ ان کے متعلق امید تھی کہ آئندہ جب ضد کی فضا ختم ہوگی تو وہ اپنے معاملہ پر نظر ثانی کریں گے اور ایمان قبول کر کے تمہارے ساتھی اور حمایتی بن جائیں گے۔ ایسے لوگوں کی اشتعال انگیزی پر ان سے لڑنا نہیں ہے بلکہ اشتعال کو نظر انداز کر کے ایسے حالات پیدا کرنا ہے کہ ان پر دعوتی عمل جاری کیا جاسکے۔ جن لوگوں کو دعوت کے ذریعہ مسخر کرنے کا موقع ہو ان کو دشمن کے خانہ میں ڈال کر ان کے خلاف لڑائی چھیڑنا اسلام میں ہرگز جائز نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس وقت دو قسم کے مسئلے تھے۔ ایک مسئلہ یہ تھا کہ موحد اعظم حضرت ابراہیم کی بنائی ہوئی مسجد میں سیکڑوں بت رکھ دیے گئے تھے اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے لیے اس میں داخلہ پر پابندی لگادی گئی تھی۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ اس دستوری حق کو حاصل کرنے اور مسجد کو بتوں سے پاک کرنے کی مہم چلانے میں بیک وقت دو نقصان تھا ——— مسلمانوں کا قتل وخون اور متوقع مومنین سے محرومی۔ آپ نے اس وقت یہ کیا کہ پہلے مسئلہ کو دوسرے مسئلہ کے تابع کر دیا۔ آپ نے دوسرے مسئلہ کی فوری رعایت فرمائی اور پہلے مسئلہ کو مستقبل کے خانہ میں ڈال دیا۔

یہ تدبیر نہایت موثر ثابت ہوئی۔ ۶ھ میں دوسرا مسئلہ حل ہوا، اور ۸ھ میں پہلا مسئلہ۔ آپ حال کے بھی مالک بن گیے اور مستقبل کے مالک بھی۔ یہ پیغمبر کا طریقہ ہے۔ اور پیغمبر کے طریقہ کے سوا کسی اور طریقہ میں کامیابی اور نجات نہیں۔

حق کی طاقت

ابرہہ (Abrames) قدیم یمن (جنوبی عرب) کا حبشی عیسائی حکمراں تھا۔ اس نے یمن کے دارالسلطنت صنعار میں ایک بہت بڑا مسیحی کلیسا (Ekklesia) بنایا۔ چونکہ جزیرہ عرب کا سب سے زیادہ مقدس عبادت خانہ کعبہ کو سمجھا جاتا تھا اور زیادہ تر لوگ اسی کی زیارت کے لیے جایا کرتے تھے، ابرہہ نے چاہا کہ وہ کعبہ کو ڈھادے تاکہ تمام لوگ اس کے بنائے ہوئے عبادت خانہ میں آئیں، اور اس طرح عرب کا مذہبی مرکز مکہ سے صنعار کی طرف منتقل ہو جائے۔

اس منصوبہ کے مطابق، ابرہہ ۵۷۰ء میں یمن سے مکہ کے لیے روانہ ہوا۔ اس کا لشکر ۶۰ ہزار مسلح آدمیوں پر مشتمل تھا۔ اس کے ساتھ ایک درجن ہاتھی تھے جو آگے آگے چل رہے تھے۔ اس واقعہ کی تفصیلات بہت لمبی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ مکہ کے سردار عبدالمطلب کو جب معلوم ہوا کہ اس قسم کا بے پناہ لشکر کعبہ کو ڈھانے کے لیے مکہ کی طرف بڑھ رہا ہے تو انھوں نے محسوس کیا کہ وہ خود اس سے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتے۔ چنانچہ انھوں نے بیت اللہ میں داخل ہو کر اللہ سے دعائیں کیں۔ اس سلسلہ میں ان کے بہت سے اشعار کتابوں میں آئے ہیں، ان کا ایک شعر یہ تھا:

یاربِّ لَا ارجو لَھُم سِواکا　　یاربِّ فَامنَعْ مِنْھُم حِماکا

(اے میرے رب، ان کے مقابلہ میں تیرے سوا میں کسی سے امید نہیں رکھتا، اے میرے رب، تو ان سے اپنے حرم کی حفاظت کر) اس طرح عبدالمطلب نے کعبہ کو اللہ کے حوالے کیا اور قبیلہ کے دوسرے لوگوں کے ساتھ بستی سے نکل کر پہاڑوں میں چلے گیے اور وہاں چھپ کر بیٹھ گیے۔

ابرہہ اپنے لشکر کے ساتھ بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ جب وہ حدودِ حرم پر پہونچا تو اس کے ہاتھی نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ اس کو مار مار کر زخمی کر دیا گیا مگر وہ آگے نہ بڑھا۔ اسی دوران بے شمار چڑیوں کے جھنڈ فضا میں ظاہر ہوئے۔ ان کے چونچ اور ان کے پنجوں میں کنکریاں تھیں۔ انھوں نے یہ کنکریاں ابرہہ کے لشکر پر گرائیں تو وہ گولیوں کی بارش کی مانند ان پر برسنے لگیں۔ ابرہہ سمیت پورا لشکر بھس کی طرح چورا چورا ہو کر رہ گیا۔ یہ واقعہ مکہ کے قریب وادی محسّر میں پیش آیا۔

اس واقعہ کے بعد عربوں نے قدیم رواج کے مطابق بہت سے اشعار لکھے اور ان میں اپنے

جذبات اور مشاہدات کا اظہار کیا۔ ابو قیس بن الاسلت کا ایک شعر یہ ہے :

فَلَمَّا أَتَاكُمْ نَصْرُ ذِي الْعَرْشِ رَدَّهُمْ جُنُودُ الْمَلِيكِ بَيْنَ سَافٍ وَحَاصِبِ

پھر جب تمہارے پاس عرش والے کی مدد آگئی تو اس بادشاہ کے لشکر (پرندوں) نے ان کو مٹی اور اور پتھر سے مار کر پسپا کر دیا (سیرۃ ابن ہشام، الجزء الاول۔ صفحہ ۶۲)

ابرہہ کا مذکورہ واقعہ ۵۷۰ ء میں پیش آیا تھا۔ اس کے ٹھیک ۵۸ سال بعد ۶۲۸ء میں اسی مکہ کی سرحد پر ایک اور واقعہ اس سے مختلف صورت میں پیش آیا۔ یہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ واقعہ ہے جو اسلامی تاریخ میں صلح حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے۔

اس وقت رسول اللہ علیہ وسلم اپنے دار ہجرت (مدینہ) میں تھے۔ ایک خواب کے مطابق آپ اپنے تقریباً ڈیڑھ ہزار اصحاب کے ساتھ عمرہ کے ارادہ سے مکہ کے لیے روانہ ہوئے۔ آپ مکہ کے قریب حدیبیہ کے مقام پر پہونچے تھے کہ مکہ کے قریش نے آگے بڑھ کر آپ کو روکا۔ انھوں نے کہا کہ ہم آپ کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ آپ عمرہ کیے بغیر مدینہ واپس جائیں۔

قریش کا آپ کو عمرہ سے روکنا یقینی طور پر ظلم اور سرکشی کا واقعہ تھا۔ بظاہر دیکھئے تو یہاں قریش مکہ بدلی ہوئی صورت میں وہی کردار ادا کر رہے تھے جو ۵۸ سال پہلے ابرہہ نے ادا کیا تھا۔ اب بظاہر یہ ہونا چاہیے تھا کہ جس طرح ابرہہ کے اوپر خدا نے آسمانی سزا بھیجی اسی طرح دوبارہ قریش کے اوپر آسمانی سزا آتی اور انھیں تباہ کر دیتی تاکہ وہ رسولؐ اور اصحاب رسولؐ کی راہ میں رکاوٹ نہ بنیں۔

مگر ایسا نہیں ہوا۔ پھر اس فرق کا سبب کیا ہے۔ اس فرق کا کم از کم ایک سبب یہ ہے کہ ابرہہ کے حملہ کے وقت فریق ثانی کے پاس وہ نظریاتی ہتھیار موجود نہ تھا جو پیغمبر اسلامؐ کے ساتھ حدیبیہ کے واقعہ کے وقت موجود تھا۔

ابرہہ کے حملہ کے وقت ابھی قرآن کا نزول نہیں ہوا تھا۔ مگر اس کے ۵۸ سال بعد جب حدیبیہ کا واقعہ پیش آیا، اس وقت پیغمبر آخر الزماں مبعوث ہو چکے تھے۔ اور ان کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنا سچا دین قرآن کی صورت میں بھیج دیا تھا۔

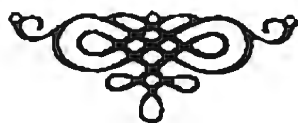
اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے کہ وہ دین کی اور اہل دین کی حفاظت فرمائے گا۔ تاہم ابرہہ کے زمانہ

میں اللہ تعالیٰ نے دین کی حفاظت کا انتظام اس طرح کیا کہ حق کے دشمنوں پر آسمان سے پتھر برسائے۔
مگر پیغمبر آخر الزماںؐ کی بعثت کے بعد اب صورت حال بدل چکی تھی۔ اب اہل حق کے پاس دینِ فطرت کی صورت میں وہ طاقت ور ہتھیار موجود ہے جس کے آگے کوئی مخالفانہ ہتھیار کارگر نہیں ہو سکتا۔ یہ دین لوگوں کے دلوں اور دماغوں پر حملہ کرتا ہے۔ وہ دشمن کو دوست کے روپ میں بدل دیتا ہے۔ وہ انسان کو اندر سے مسخر کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ یہ دین بلاشبہ سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ اور جب آدمی کے پاس بڑا ہتھیار ہو تو چھوٹا ہتھیار استعمال کرنے کی ضرورت نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب حدیبیہ میں قریش سے دس سال کا ناجنگ معاہدہ کر کے لوٹے تو قرآن میں یہ آیت اتری کہ خدا نے تم کو کھلی فتح دے دی اور تم کو نصرِ عزیز سے سرفراز فرمایا (الفتح) چنانچہ اس کے صرف دو برس بعد لوگوں نے دیکھا کہ جو لوگ اسلام کے دشمن بنے ہوئے تھے، وہ اسلام کے دوست اور اس کے دست و بازو بن گئے ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کے خلاف جو لوگ سرکشی کر رہے تھے، ان کے بارہ میں قرآن میں کہا گیا ——— بلکہ ہم حق کو باطل پر ماریں گے تو وہ اس کا سر توڑ دے گا اور دفعۃً وہ جاتا رہے گا (الانبیاء ۱۸) چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ عبد المطلب کے زمانہ میں ابرہہ کے لشکر کو پتھروں سے مار کر ہلاک کیا گیا تھا، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں سرکشی کرنے والوں کو خود حق کی ضرب سے مفتوح اور مغلوب کر دیا گیا۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ فکری اور نظریاتی شکست، فوجی شکست سے کہیں زیادہ سخت ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ایک جاری نبوت ہے۔ وہ قیامت تک باقی رہے گی۔ اس دوسرے دور میں حق کے مخالفین کو زیر کرنے کے لیے انھیں کنکر پتھر مارنے کی ضرورت نہیں۔ اہلِ حق کو چاہیے کہ وہ حق لے کر اٹھیں جس طرح پیغمبر اسلامؐ حق لے کر اٹھے۔ اور پھر تمام مخالفینِ حق ان کے سامنے سے بھاگتے ہوئے نظر آئیں گے: جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا (حق آیا اور باطل مٹ گیا، اور باطل تھا ہی مٹنے والا)



دروازہ کھلتا ہے

روس میں ۱۹۱۷ میں کمیونسٹ انقلاب آیا۔ اس کے بعد پورے سوویت روس میں مذہب کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔ مذہب کے نام پر تنظیم بنانا، اجتماع کرنا، کتاب چھاپنا، ہر چیز قانونی طور پر ممنوع قرار پائی۔ تاہم نصف صدی کی مجنونانہ مذہب دشمنی کے بعد وہاں کے حالات بدلنا شروع ہوئے۔ اندازہ ہے کہ امریکی صدر مسٹر رونالڈ ریگن کا دورۂ ماسکو (۲۹ مئی - ۲ جون ۱۹۸۸) اس اعتبار سے روس میں نئے دور کا آغاز ہوگا۔ ریگن روسی حکمرانوں سے جو بات منوانا چاہتے ہیں۔ ان میں مذہبی آزادی بھی خصوصیت کے ساتھ شامل ہے۔

اس دورہ کے موقع پر ماسکو میں ۶۳ ملکوں کے تقریباً ساڑھے پانچ ہزار جرنلسٹ جمع ہوئے۔ ان کا کہنا ہے کہ ۱۹۷۴ میں جب نکسن۔ برزنیف ملاقات ماسکو میں ہوئی تھی تو صحافیوں پر سخت پابندیاں تھیں۔ مگر اس بار انھیں ہر قسم کی کھلی آزادی حاصل رہی۔ یہ روس میں ایک نئے انقلاب کی علامت ہے جس کا آغاز روس کے موجودہ حکمراں گورباچیف نے کیا ہے۔

اس سلسلہ میں ماسکو سے جو خوش آئند خبریں آئی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ انٹرنیشنل پولس کے دفتر کے سامنے مختلف چیزوں کی فروخت کا انتظام کیا گیا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ غیر معمولی چیز بائبل کا روسی ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ روس میں مسیحیت کی ہزار سالہ برسی کے موقع پر چھاپا گیا ہے اور اس کی قیمت ۶۵ ڈالر ہے:

> The most unusual buy has to be the modern Russian version of the Bible on sale periodically in the lobby in front of the international press briefing room. Put out to commemorate this summer's 1000th anniversary of Christianity in the Soviet Union, it retails for $65.

یہ خبر ٹائمس آف انڈیا (۳۰ مئی ۱۹۸۸) میں صفحہ ۷ پر اور ہندستان ٹائمس (۳۰ مئی ۱۹۸۸) میں صفحہ ۱۶ پر شائع ہوئی ہے۔ یہ ایک بے حد اہم خبر ہے۔ وہ بظاہر مسیحیت کی ہزار سالہ برسی سے تعلق رکھتی ہے، اگر حقیقۃً وہ اشتراکی روس میں مذہب کے از سر نو احیاء کی علامت ہے۔ یہ خبر بتاتی ہے کہ عارضی وقفہ کے بعد روس میں دوبارہ مذہب کو آزادانہ عمل کے مواقع حاصل ہو گئے ہیں۔

نظریۂ ارتقاء

چارلس ڈاروِن (۱۸۸۲-۱۸۰۹) نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ زندگی ارتقائی عمل کے ذریعہ ظہور میں آئی ہے۔ یعنی ابتداءً پانی اور کیچڑ کے تعامل سے زندگی کا پہلا جرثومہ بنا۔ پھر لمبی مدت تک وہ مختلف ارتقائی مراحل سے گزرتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ نوع بن کر تیار ہوئی جس کو انسان کہا جاتا ہے۔

یہ نظریہ لوگوں کو بہت پسند آیا اور ابتدا میں اس کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ مگر بعد کی بعض تحقیقات نے اس کو ناقابلِ فہم بنا دیا۔ اس میں سے ایک زمین کی عمر تھی۔ سائنسی طریقوں کو استعمال کرکے زمین کی عمر تقریباً متعین طور پر معلوم ہوگئی۔ مگر یہ عمر ارتقائی مفروضہ سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ کیوں کہ سائنس نے زمین کی جو عمر بتائی وہ اتنی کم تھی کہ مفروضہ ارتقائی عمل کے لیے وہ کسی طرح کافی نہیں ہو سکتی۔

اس دریافت کے بعد ارتقاء پسند علماء نے ایک اور دعویٰ کرنا شروع کیا۔ انھوں نے کہا کہ ارتقاء کا نظریہ بذاتِ خود صحیح ہے۔ البتہ ارتقاء کا ابتدائی عمل زمین پر نہیں ہوا بلکہ بالائی خلا میں ہوا۔ بالائی خلا میں ستاروں کے اوپر زندگی کا ابتدائی جرثومہ تیار ہوا۔ پھر وہ وائرس اور بیکٹیریا کی صورت میں دمدار ستارہ (Comet) کی دم پر سوار ہو کر زمین تک پہونچا۔ اس نظریہ کے علم بردار خاص طور پر دو امریکی سائنس داں تھے، ان کے نام یہ ہیں:

1. Fred Hoyle, 2. Carl Sagan

مگر اب یہ نظریہ بھی بالکل بے بنیاد ثابت ہوا ہے۔ روس کا ایک خلائی جہاز ویگا (Vega 1) ہر قسم کے آلات سے لیس ہو کر بالائی خلا میں گیا اور وہ ہیلی دمدار ستارہ (Halley's comet) کی دم کے پاس سے گزرا۔ اس کے آلات نے جو معلومات ریکارڈ کی ہیں، ان سے معلوم ہوا ہے کہ اس کی دم کے اندر وہ ضروری اجزاء موجود نہیں جن سے زندہ خلیے (Living cells) ترکیب پاتے ہیں۔ چنانچہ ساگن (پروفیسر کارنیل یونیورسٹی، نیویارک) جنھوں نے ۳۰ سال تک بالائے خلا زندگی کے موضوع پر تحقیق کی ہے، انھوں نے اعلان کیا ہے کہ ویگا کی دریافتوں نے خلائی زندگی (Life-from-space) کے نظریہ کو بے بنیاد ثابت کر دیا ہے۔ (ٹائمس آف انڈیا ۳ مئی ۱۹۸۸)

عبرت ناک

ہندستان کی آزادی کے ذیل میں ہندستانی علماء کی تقریریں سنیے یا ان کی تحریریں پڑھیے تو اس میں ہمیشہ علماء کی زبردست قربانیوں کا تذکرہ ہوگا۔ اور پرجوش طور پر یہ کہا جائے گا کہ ہندستان کو آزادی ہم نے دلائی۔ علماء اور مسلم عوام لاکھوں کی تعداد میں قربان نہ ہو گیے ہوتے تو انگریز ہندستان کے مطالبۂ آزادی کو تسلیم نہیں کر سکتا تھا۔

یہ بات اگرچہ کلی طور پر نہیں تاہم جزئی طور پر یقیناً صحیح ہے۔ مگر عبرت ناک بات یہ ہے کہ علماء کے دعووں کے باہر اس کا اعتراف کہیں موجود نہیں۔ ہندستان میں قومی سطح پر آزادی کی جو تاریخیں لکھی گئی ہیں ان میں علماء ہند کا یہ "شاندار باب" بالکل حذف ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہندستان سے باہر عالمی سطح پر ہندستان کی آزادی کی تاریخ کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اس میں بھی اس کا تذکرہ موجود نہیں۔

اس کی ایک مثال انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کا وہ مضمون ہے جو سبھاش چندر بوس (۱۸۹۷ - ۱۹۴۵) کے عنوان کے تحت درج کیا گیا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ دوسری جنگ عظیم میں جب جاپانیوں نے سنگاپور پر قبضہ کر لیا تو سبھاش چندر بوس جاپان پہونچے۔ وہاں انھوں نے اکتوبر ۱۹۴۳ میں "آزاد ہند حکومت" کی بنیاد ڈالی۔ اور اس کے تحت ایک آزاد ہند فوج (Indian National Army) بنائی۔ اس فوج کے افراد زیادہ تر وہ ہندستانی فوجی تھے جو انگریزی فوج میں شامل تھے اور جنھوں نے جاپان کی فتح کے بعد ہتھیار ڈال دیے تھے۔

سبھاش چندر بوس اس فوج کو لے کر رنگون پہونچے تاکہ وہاں سے ہندستان کی طرف مارچ کر سکیں۔ یہاں ان کا مقابلہ انگریزی فوج سے ہوا جس میں انھیں شکست ہوئی۔ اس کے بعد ان کا دل ٹوٹ گیا۔ ایک حادثہ کا شکار ہو کر وہ کچھ دن جاپان کے اسپتال میں رہے اور وہیں ۱۹ اگست ۱۹۴۵ کو انتقال کر گیے۔

سبھاش چندر بوس کے تذکرے کے تحت انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں لکھا گیا ہے کہ سبھاش چندر بوس نے اپنے عمل سے یہ ثابت کیا کہ برطانی فوج کے ہندستانی سپاہیوں میں بھی حبّ وطن کا جوش پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اپنے اس عمل سے انھوں نے وہ اثرات ڈالے جو بالآخر ہندستان

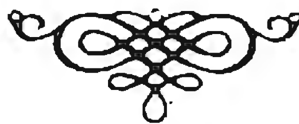
کی آزادی تک پہونچے :

By his actions, Bose proved that Indians in the British Indian army could also be inspired by patriotic fervour, and by his work he influenced the conference that led to Indian independence (3/53).

اس اقتباس کو پڑھنے کے بعد میں نے سوچا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ جس واقعہ کو ہندستانی علماء اپنے خانہ میں درج کیے ہوئے ہیں وہ عالمی ریکارڈ میں "سبھاش چندر بوس" کے خانہ میں لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ اس سوال کا جواب مجھے اس وقت ملا جب کہ میں نے انسائیکلو پیڈیا میں سبھاش چندر بوس کے مذکورہ مضمون کے نیچے اس کی کتابیات (Bibliography) دیکھی۔ اس کتابیات میں انگریزی کتابوں کی ایک لمبی فہرست ہے جو سبھاش چندر بوس کی زندگی اور ان کی جدوجہد کے بارے میں لکھی گئی ہیں اور جن سے معلومات اخذ کرتے ہوئے یہ مضمون تیار کیا گیا ہے۔ ہمارے علماء دنیا کو اس قسم کی "کتابیات" نہ دے سکے۔ اس لیے دنیا نے نہ ان کو جانا اور نہ ان کا تذکرہ کیا۔

موجودہ زمانہ میں جو مسلم علماء قیادت کے لیے اٹھے ان کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ انگریزی زبان یا اور کسی مغربی زبان سے ناواقف تھے۔ مزید یہ کہ انھوں نے انگریزی تعلیم کا مسلسل اس طرح استخفاف کیا کہ قوم کے دوسرے لوگ بھی بہت کم انگریزی تعلیم کی طرف مائل ہو سکے۔ اور جو شخص انگریزی تعلیم کی طرف گیا وہ بھی یہ سمجھ کر گیا کہ وہ علماء سے اور ان کے مذہب سے باغی ہو کر انگریزی تعلیم کی طرف جا رہا ہے۔ اس انحراف کے بعد وہ علماء کے کام نہیں آسکتا تھا اور نہ وہ ان کے کام آیا۔

انسائیکلو پیڈیا یا دوسری مغربی کتابوں کے مذکورہ بیانات کو عام مسلمان اور خود ہمارے علماء "مستشرقین کے تعصب" کے خانہ میں ڈالتے ہیں۔ مگر میں اس کو خود علماء اور مسلمانوں کی اپنی کمی کے خانہ میں ڈالتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنی کمی کو دور کر کے ہی اس تاریخی صورت حال کو بدل سکتے ہیں، تعصب اور سازش کا الزام لگانے سے نہ اب تک کوئی فائدہ ہمیں ملا ہے اور نہ آئندہ اس سے کوئی فائدہ ہمیں مل سکتا ہے۔



ایک سفر

۱۷ مئی ۱۹۸۸ کو رمضان کے مہینہ کی آخری تاریخ تھی اور ۲ بجے دن کا وقت۔ میں دہلی میں اپنے دفتر میں تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ رسیور اٹھایا تو معلوم ہوا کہ حیدرآباد سے جناب احمد بختیار الدین صاحب بول رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ساتھیوں کے مشورہ سے حیدرآباد کے اجتماع کے لئے ۳-۴-۵ جون ۱۹۸۸ کی تاریخ طے ہوئی ہے۔ میں نے اپنی ڈائری دیکھ کر ان تاریخوں سے اتفاق کیا، اور دو منٹ کے بعد گفتگو ختم ہو گئی۔

یہ مواصلات (Communication) کا ایک معاملہ تھا۔ موجودہ زمانہ میں مواصلات کی بے حد اہمیت ہو گئی ہے۔ قدیم زمانہ میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پیغام پہنچانے کے لئے ہفتوں اور مہینوں لگ جاتے تھے۔ جدید مواصلاتی ذرائع کی دریافت نے اس چیز کو ممکن بنا دیا ہے جس کو فوری انتقالِ خبر (Instantaneous transmission) کہا جاتا ہے۔ اور جس کے ذریعہ سے یہ ممکن ہو گیا ہے کہ لکھے یا بولے ہوئے الفاظ کو بلا تاخیر دنیا کے کسی بھی حصے میں پہنچایا جا سکے (10/655)۔

یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی عجیب نعمت ہے۔ اس نے انسانی شخصیت کو آفاقی وسعت دیدی ہے۔ اس نعمت کا سب سے زیادہ استعمال دعوت کے لئے ہونا چاہئے تھا۔ مگر آج اس کا سب سے کم استعمال جہاں ہو رہا ہے وہ دعوت ہی ہے۔ کچھ لوگ اپنے دعوے کے مطابق جدید ذرائع کو دعوت میں استعمال کر رہے ہیں۔ مگر یہ محض غلط فہمی ہے۔ یہ لوگ جس کام میں مشغول ہیں وہ مناظرہ بازی، سیاسی جھگڑے اور دنیوی ہنگامے ہیں نہ کہ حقیقۃً دعوت الی اللہ۔ مسلمانوں کی موجودہ سرگرمیاں دراصل ان کے قومی فخر کا اظہار ہیں۔ جب کہ دعوت الی اللہ وہ مقدس عمل ہے جو ایک طرف خوف خداوندی اور دوسری طرف شفقت انسانی کے جذبہ کے تحت ظاہر ہوتا ہے۔

دہلی سے حیدرآباد کا سفر انڈین ایرلائنز کی فلائٹ نمبر ۴۳۹ کے ذریعہ ہوا۔ ۳ جون ۱۹۸۸ کی صبح کو حیدرآباد کے ہوائی اڈہ پر اترا تو وہاں ۳۱ درجہ گرمی تھی اور تیز ہوا چل رہی تھی۔ ہوائی جہاز سے ہوائی اڈہ کی عمارت تک پیدل سفر کرنا تھا۔ میں چل رہا تھا کہ میری دوپلی ٹوپی سر سے اڑ گئی اور وسیع پختہ میدان میں ہوا کے ساتھ تیزی سے بھاگنے لگی۔ میں چند قدم اس کی طرف بڑھا۔ مگر جس تیزی سے وہ

مخالف سمت میں بھاگی جارہی تھی، میں نے محسوس کیا کہ میرے جیسے کمزور آدمی کے لیے اس تک پہنچنا ممکن نہیں ہے۔ ہوائی اڈہ کے اسٹاف کا ایک آدمی جو اپنے لباس سے کوئی افسر معلوم ہو رہا تھا، اس نے یہ منظر دیکھا تو وہ اس کو پکڑنے کے لئے آگے بڑھا، اور دوڑ کر ٹوپی کو اٹھا لایا۔ میں نے پوچھا کہ آپ کا نام۔ اس نے اپنا دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا: "گوکل پٹیل"

اس واقعہ کے بعد میں نے سوچا کہ اس دنیا میں ہر آدمی اچھا آدمی ہے۔ وہ صرف اس وقت برا آدمی بن جاتا ہے جب کہ ہم اپنی نادانی سے اس کو چھیڑیں اور اس کی انا کو جگا دیں۔ انا کے جاگنے کے بعد اپنی قوم کا آدمی بھی اتنا ہی خونخوار ہو جاتا ہے جتنا کوئی غیر قوم کا آدمی۔

جہاز کے اندر میں اخبار پڑھ رہا تھا۔ آج تمام اخبار میں مسٹر راج کپور کے انتقال کی خبر تھی جن کو ہندستان کا سب سے بڑا نمائشی انسان (Showman) کہا جاتا ہے۔ ایک اخبار نے حسب ذیل الفاظ میں اس کی سرخی لگائی تھی:

The end of a living legend.

میں انھیں خیالات میں تھا کہ اناؤنسر نے اعلان کیا "اب سے کچھ دیر بعد ہمارا بمان حیدرآباد اترے گا۔" میں نے سوچا کہ ایک کا جہاز اتر چکا، دوسرے کا جہاز اترنے والا ہے۔ اسی طرح تمام لوگوں کے "جہاز" خدا کی دنیا میں اتر جائیں گے۔ یہ لمحہ بہر حال ہر ایک پر آنے والا ہے، کوئی اس کو ٹال نہیں سکتا۔ تاہم کسی کے لئے اس کا اترنا محفوظ اترنا (Safe landing) ہوگا، اور کسی کے لیے اس کا اترنا تباہی کا اترنا (Crash landing)۔

حیدرآباد میں میرا قیام جناب حبیب بھائی کی رہائش گاہ پر تھا۔ یہاں لوگ برابر آتے رہے اور ان سے دعوتی و تعمیری موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ اندازہ ہوا کہ حیدرآباد میں اسلامی مرکز کے پیغام کی اشاعت کا کام کافی بڑھا ہے اور دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ تعلیم یافتہ طبقہ عام طور پر اس مشن سے واقف ہو چکا ہے۔ الرسالہ اکیڈمی اور دوسرے بہت سے انفرادی اشخاص الرسالہ اور اس کے مشن کو پھیلانے میں مسلسل مصروف ہیں۔

حیدرآباد کا ذکر ہوتا ہے تو لوگ عام طور پر نظام کی دولت کا، چار مینار کا، سالار جنگ میوزیم کا اور اس طرح کی دوسری چیزوں کا ذکر کرتے ہیں۔ مگر میرا ذوق اس معاملہ میں بالکل مختلف ہے۔

حیدرآباد کے تمام معلوم واقعات میں مجھ کو سب سے زیادہ جو واقعہ پسند ہے وہ تقریباً ۸۰ سال پہلے پیش آنے والا واقعہ ہے۔ یہ ڈاکٹر نشی کانت چٹو پادھیا کے قبولِ اسلام کا واقعہ ہے۔

پچھلی صدی میں لاکھوں کی تعداد میں لوگوں نے اسلام قبول کیا ہے۔ ان میں سے بہت سے لوگوں کے حالات زندگی میں نے پڑھے ہیں۔ مگر جس گہرے شعور کے ساتھ ڈاکٹر چٹو پادھیا نے اسلام قبول کیا، اس کی مثال، میرے علم کی حد تک کسی دوسرے کے یہاں نہیں ملتی۔

اگھورناتھ چٹو پادھیا ایک بنگالی برہمن تھے۔ انھوں نے بنگال سے آکر حیدرآباد میں رہائش اختیار کی۔ یہاں وہ نظام کالج کے پرنسپل تھے۔ سروجنی نائیڈو (۱۹۴۹ - ۱۸۷۹) انھیں کی بڑی صاحبزادی تھیں جنھوں نے اپنی مختلف خصوصیات کی بنا پر کافی شہرت حاصل کی۔ بوقت انتقال وہ اترپردیش کی گورنر تھیں۔

ڈاکٹر نشی کانت چٹو پادھیا اسی خاندان کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ فرد تھے۔ وہ مہاراجہ کالج میسور میں تاریخ کے استاد تھے۔ اس کے بعد وہ حیدرآباد کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ وہ بیک وقت کئی زبانیں جانتے تھے۔ ان کے اندر حق کی تلاش کا جذبہ ابھرا۔ انھوں نے مختلف ممالک کا سفر کیا۔ فلسفہ اور مذہب کا نہایت تفصیلی مطالعہ کیا۔ آخر میں وہ اسلام کی صداقت پر مطمئن ہوئے اور اسلام قبول کرکے اپنا نام محمد عزیزالدین رکھا۔ ان کی دو کتابیں برٹش میوزیم (لندن) میں موجود ہیں جن کو اسی زمانہ میں لوزاک (Luzac and Sons) نے چھاپا تھا۔ ان کتابوں کو جناب حسن الدین احمد صاحب نے دوبارہ چھپوا دیا ہے۔ ان کے نام یہ ہیں:

1. *Muhammad: The Prophet of Islam*
2. *Why Have I Accepted Islam*

یہ دونوں دراصل دو لکچر ہیں جو بالترتیب ۲۵ نومبر ۱۹۰۴ اور ۲۶ نومبر ۱۹۰۴ کو حیدرآباد میں دئے گئے۔ ایک لکچر میں انھوں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ حیدرآباد میں اسلامی دعوت کا ایک سنٹر قائم کیا جائے (ملاحظہ ہو عظمت قرآن، صفحہ ۱۴۵ - ۱۴۶) یہ بلاشبہ اہم ترین بات تھی جو ایک بندہ خدا کی زبان سے ادا ہوئی۔ مگر اس تجویز پر ۸۰ سال بیت گئے اور کسی نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔ راقم الحروف نے ۱۹۸۳ میں اس مقصد کے لئے حیدرآباد میں ایک دعوتی مرکز قائم کرنا چاہا۔ اس کی عملی

صورتیں بھی پیدا ہوئیں ۔ مگر جلد ہی لوگوں کی بے حسی اور اخلاقی پستی نے اس قیمتی منصوبہ کو خاک میں ملا دیا ۔

خلیفہ چہارم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب حالات میں بگاڑ پیدا ہوا تو کچھ لوگوں نے حضرت علی سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ عمر فاروق کے زمانہ میں حالات درست تھے اور آپ کے زمانہ میں حالات بگڑ گئے ۔ اس کے جواب میں حضرت علی نے فرمایا کہ " عمر کے ساتھی میرے جیسے لوگ تھے، میرے ساتھی تمہارے جیسے لوگ ہیں " حقیقت یہ ہے کہ ہر منصوبہ سب سے پہلے قابل اعتماد افراد چاہتا ہے ۔ اگر قابل اعتماد افراد حاصل نہ ہوں تو بہتر سے بہتر منصوبہ بھی زیر عمل نہیں لایا جاسکتا ، حتی کہ " خلیفہ راشد " کی موجودگی میں بھی نہیں ۔

۱۸۵۷ کی " جنگ آزادی " انگریزوں اور ہندستانیوں کے درمیان تھی ۔ اس جنگ میں حیدر آباد کے مسلم حکمراں (نظام) نے انگریزوں کا ساتھ دیا ۔ قومی اصطلاح میں یہ واضح طور پر " غداری " کا کیس تھا ۔ مگر بعد کی تقریباً سو برس کی تاریخ بتاتی ہے کہ " غدار نظام " سے ملت کو بے شمار فائدے پہنچے ۔ جب کہ " مجاہد نظام " سے ملّت کو کسی بھی قسم کا کوئی مثبت فائدہ نہ پہنچ سکا ۔

موجودہ زمانہ میں بیشتر اسلامی ادارے عربوں کے " پٹرو ڈالر " کی امداد پر چل رہے ہیں ۔ تمام مشہور شخصیتوں کے پیچھے یہی پٹرو ڈالر کی طاقت ہے ۔ پٹرو ڈالر کے ظہور سے پہلے یہی حیثیت نظام حیدر آباد کو حاصل تھی ۔ اس زمانہ میں برصغیر کے اکثر اسلامی ادارے نظام کے مالی تعاون کی بنیاد پر چل رہے تھے ۔ اسی طرح حیدر آباد کے نواب نے دوسرے بہت سے ملی مفاد والے کام کئے ہیں جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ۔

پچھلے ڈیڑھ سو برس کی تاریخ ہنگامہ خیز مسلم تحریکوں کی تاریخ ہے ۔ ان تحریکوں نے مسلمانوں کے جان و مال کو برباد تو ضرور کیا جس کو بطور خود انھوں نے قربانی کا شاندار نام دیا ہے ۔ مگر ان میں کوئی بھی قابل ذکر مسلم تحریک نہیں جس نے مسلمانوں کو حقیقی معنوں میں کوئی مثبت فائدہ پہنچایا ہو ۔ اس کا کم از کم ایک بنیادی سبب یہ تھا کہ ان تحریکوں کے قائدین نے ممکن اور ناممکن کے فرق کو نہیں سمجھا ۔ وہ ممکن کو چھوڑ کر ناممکن کے پیچھے دوڑتے رہے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ممکن کو حاصل کرنے میں بھی ناکام رہے ۔

اس کی ایک مثال " ریاست حیدر آباد " کا معاملہ ہے جو ۱۹۴۷ کے انقلاب کے دوران طوفان

کی طرح اٹھا اور گرد وغبار کی طرح ختم ہوگیا۔ اس کی وجہ ہمارے قائدین کی یہی غیر حقیقت پسندانہ سیاست تھی۔ انھوں نے اس راز کو نہیں جانا جس کو ایک مفکر نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے کہ سیاست ممکن کا فن ہے:

(Politics is the art of possible).

یہاں میں سابق پاکستانی وزیر اعظم چودھری محمد علی (۱۹۵۵-۵۶) کا ایک اقتباس نقل کروں گا۔ اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ خود پاکستانی لیڈر کے اپنے بیان کے مطابق ۴۰ سال پہلے حیدر آباد اور کشمیر کا مسئلہ میز پر حل ہو رہا تھا۔ مگر مسلم لیڈروں نے حقائق کو نہیں سمجھا۔ وہ بیک وقت دو خرگوشوں کے پیچھے دوڑتے رہے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ان میں سے ایک کو بھی نہ پکڑ سکے۔

قدیم حیدر آباد میں چھوٹی سطح پر علم کا وہی چرچا تھا جو زیادہ بڑی سطح پر قدیم بغداد میں پایا جاتا تھا۔ مفتی محمد سعید صاحب (۱۸۳۱-۱۸۹۵) ریاست حیدر آباد میں عدالت العالیہ کے مفتی تھے۔ ان کو کتابوں کا اس قدر شوق تھا کہ اپنی آمدنی کا چوتھائی حصہ مستقل طور پر کتابوں کے حصول میں صرف کیا کرتے تھے۔ انھوں نے مکہ، مدینہ، بغداد، دمشق، قاہرہ وغیرہ کے کتب خانوں سے نایاب علمی کتابوں کی نقلیں منگوائیں۔ ہندستان میں اور عالم اسلام کے بڑے بڑے شہروں میں ان کے کاتب مقرر تھے جو نایاب کتابیں

Sardar Patel, although a bitter enemy of Pakistan, was a greater realist than Nehru. In one of the discussions between the two Prime Ministers, at which Patel and I were also present, Liaquat Ali Khan dwelt at length on the inconsistency of the Indian stand with regard to Junagadh and Kashmir. If Junagadh, despite its Muslim ruler's accession to Pakistan belonged to India because of its Hindu majority, how could Kashmir, with its Muslim majority, be a part of India simply by virtue of its Hindu ruler having signed a conditional instrument of accession to India? If the instrument of accession signed by the Muslim ruler of Junagarh was of no validity, the instrument of accession signed by the Hindu ruler of Kashmir was also invalid. If the will of the people was to prevail in Junagadh, it must prevail in Kashmir as well. India could not claim both Junagadh and Kashmir. When Liaquat Ali Khan made these incontrovertible points, Patel could not contain himself and burst out: "Why do you compare Junagadh with Kashmir? Talk of Hyderabad and Kashmir, and we could reach an agreement." Patel's view at this time and even later was that India's effort to retain Muslim majority areas against the will of the people was a source not of strength but of weakness to India. He felt that if India and Pakistan agreed to let Kashmir go to Pakistan and Hyderabad to India, the problems of Kashmir and of Hyderabad could be solved peacefully and to the mutual advantage of India and Pakistan.

Chaudhry Muhammad Ali, *Emergence of Pakistan*, pp. 299-300

نقل کرکے برابر ان کے پاس بھیجا کرتے تھے۔ یہ تمام ذخیرہ اب بھی کتب خانہ سعیدیہ کی صورت میں موجود ہے۔

اس خاندان کے ایک فرد ڈاکٹر یوسف الدین صاحب ایک بار دمشق گئے۔ پروفیسر صلاح الدین المنجد نے وہاں کا مشہور کتب خانہ ظاہریہ کا معائنہ کراتے ہوئے ان سے کہا: ہندستان کے مسلمان جب ہمارے ملک میں آتے ہیں تو وہ یہاں کی قبروں کی زیارت کے لئے جاتے ہیں، وہ ہماری کتابوں سے نہیں ملتے۔ دیکھئے، اس کتب خانہ میں دس ہزار نایاب کتابیں ہیں۔

ڈاکٹر یوسف الدین نے ان سے خاص خاص نایاب کتابوں کو دکھانے کی فرمائش کی۔ پروفیسر صلاح الدین المنجد نے ابن عساکر کی تاریخ دمشق منگوائی اور کہا کہ یہ ہمارے اس کتب خانہ کی سب سے زیادہ قدیم کتاب ہے۔ مگر یہ نامکمل ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس کے بقیہ اجزاء کہاں مل سکتے ہیں۔ ڈاکٹر یوسف الدین نے کتاب کو دیکھ کر فوراً کہا: "حیدر آباد کے کتب خانہ سعیدیہ میں اس نایاب کتاب کے بقیہ اجزاء موجود ہیں۔" (انجمن، از ڈاکٹر حسن الدین احمد، صفحہ ۱۱۵)

یہ قدیم حیدر آباد کا حال تھا۔ آج حیدر آباد کے مسلمانوں کے پاس پہلے سے بھی زیادہ دولت موجود ہے۔ مگر آج ان کی دولت کا مصرف علم نہیں۔ آج وہ اپنی دولت کو ایسی بے معنی مدوں میں ضائع کر رہے ہیں جن کا نہ علم سے کوئی تعلق ہے اور نہ عقل سے۔

حیدر آباد کی سڑکوں پر چلتے ہوئے ایک جگہ آپ کو ایک اونچے مینار پر اقبال کے شاہین کی تصویر بنی ہوئی دکھائی دے گی۔ یہ "مینار اقبال" ہے۔ اقبال کی ۵۰ ویں برسی کے موقع پر اپریل ۱۹۸۸ میں اس کی نقاب کشائی چیف منسٹر مسٹر این ٹی راما راؤ نے کی۔ اس کے چاروں طرف اقبال کے تین شعر اردو ہندی، انگریزی اور تلگو زبان میں لکھے ہوئے ہیں۔

اقبال کو مفکر پاکستان کہا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں ہندستان میں اقبال کی پذیرائی اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندستان میں اختلافات کے باوجود اعتراف کا ماحول ہے۔ یہاں مسلمانوں کو مسلمان رہتے ہوئے وہ تمام مواقع حاصل ہیں جو کسی دوسرے فرقہ کو حاصل ہو سکتے ہیں۔ تاہم مواقع کو استعمال کرنے کے لئے آدمی کو خود بھی ایک قیمت دینی پڑتی ہے۔ مسلمان اگر یہ ضروری قیمت ادا نہ کریں تو ان کے لئے نہ ہندستان میں کوئی موقع ہے اور نہ پاکستان میں۔ حتی کہ مکہ مدینہ میں بھی نہیں۔

حیدر آباد میں جن لوگوں سے ملاقات ہوئی ان میں سے ایک مسٹر مدھوسدن ریڈی (پیدائش ۱۹۲۶) ہیں وہ ۱۹۸۳ میں ڈپٹی ڈائرکٹر (پلاننگ) کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔ وہ الرسالہ کے مستقل قاری ہیں اور اکثر کتابیں بھی پڑھ چکے ہیں۔

مسٹر ریڈی نے بتایا کہ راقم الحروف کے حیدر آباد پہنچنے سے ایک دن پہلے انھوں نے خواب دیکھا کہ مسز اندرا گاندھی ان کے یہاں آئی ہیں۔ وہ مسٹر ریڈی سے کہہ رہی ہیں کہ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ مولانا وحید الدین خاں یہاں آئے ہیں۔ میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔ مجھ کو لے جا کر ان سے ملا دو" اس خواب کی حقیقت کے بارہ میں مزید مجھے کچھ نہیں معلوم۔ میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ۳ جون کو مسٹر ریڈی نے حبیب بھائی کی قیام گاہ پر کئی لوگوں کے سامنے اپنا یہ خواب بیان کیا۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ کی بہت سی باتوں سے مجھے اتفاق ہے۔ مگر آپ کی یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ مسلمانوں کو بس صبر واعراض ہی کا سبق دیتے رہتے ہیں۔ حالاں کہ اسلام میں سب سے بڑی چیز جہاد وقتال ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے جہاد وقتال کو منسوخ ہی کر دیا ہے۔

میں نے کہا کہ جہاد کو میں نے منسوخ نہیں کیا، بلکہ مشروط کیا ہے۔ آپ قرآن وسنت کی روشنی میں غور کیجئے تو معلوم ہوگا جہاد (بمعنی قتال) کچھ لازمی شرطوں کے ساتھ مشروط ہے۔ پہلی بات یہ کہ نزاع کو یک طرفہ طور پر اوائڈ کرتے ہوئے دعوت دینا اور اس وقت تک صرف صبر و برداشت پر قائم رہنا جب تک دعوت پوری طرح مدعو تک پہنچ نہ جائے۔ اس کے بعد مدعو سے علیحدگی جس کو ہجرت کہا گیا ہے مدعو کے ساتھ مخلوط آبادی میں جہاد نہیں۔ تیسری چیز یہ کہ قوت کی فراہمی، یہاں تک کہ وہ درجۂ ارہاب تک پہنچ جائے۔ چوتھی چیز ہے باہمی اختلاف کا خاتمہ، کیوں کہ مسلمانوں کے درمیان اگر اختلاف کی حالت ہو تو پیغمبر کی موجودگی میں بھی شکست ہو جائے گی، جیسا کہ احد کے موقع پر ہوا۔ میں نے کہا کہ یہ سب جہاد کی ناگزیر شرطیں ہیں۔ ان شرطوں کی تکمیل کے بغیر جو جہاد کیا جائے وہ محض قومی لڑائی ہے نہ کہ اسلامی جہاد۔

حیدر آباد میں مولانا محمد رضوان القاسمی سے ملاقات ہوئی۔ وہ یہاں کامیابی کے ساتھ ایک دینی ادارہ چلا رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ حال میں انھوں نے عرب امارات کا سفر کیا تھا۔ وہاں ان کی ملاقات ایک صاحب سے ہوئی جنھوں نے ہمارے یہاں کی کتاب "خاتون اسلام" پڑھی تھی۔

انھوں نے کہا کہ اس موضوع پر اب تک جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں خاتون اسلام سب سے بہتر کتاب ہے۔

حیدر آباد کے قریبی مقامات سے بھی کئی لوگ آ گئے تھے مثلاً رائچور، ناندیڑ، میدک، وغیرہ۔ عبداللہ صاحب پربھنی نے بتایا کہ ایک صاحب نے ان سے کہا کہ "مولانا ہماری جو خرابیاں بتا رہے ہیں، وہ ہم سے کہیں۔ اس کو الرسالہ میں کیوں چھاپتے ہیں کہ مشرکین کو اس کی خبر ہو جائے" عبداللہ صاحب نے جواب دیا کہ آپ کو مشرکین کا خوف ہے، مگر فرشتوں کا خوف نہیں۔ مشرکین تو بتانے کے بعد جانیں گے۔ مگر ہمارے دونوں کندھوں پر جو فرشتے بیٹھے ہوئے ہیں وہ تو بتائے بغیر ہر بات جانتے ہیں اور ان کو مسلسل لکھ رہے ہیں۔" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ الرسالہ اپنے پڑھنے والوں کے اندر کس قسم کا ذہن بنا رہا ہے۔

اس سفر میں کچھ باتیں بہت غیر معمولی ہوئیں جو اس سے پہلے کسی سفر میں پیش نہیں آئی تھیں۔ ۳ جون کو ملے پلی کی بڑی مسجد میں جمعہ سے پہلے میرا خطاب تھا۔ میں نے اپنی تقریر اس جملہ سے شروع کی کہ "نماز انسانی زندگی کا حسن ہے۔" اور پھر آدھ گھنٹہ تک قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت کرتا رہا۔

میں اپنی بات پوری کر کے بیٹھ گیا۔ اس کے بعد دوسری اذان ہوئی اور خطیب صاحب نے منبر پر کھڑے ہو کر عربی زبان میں خطبہ دینا شروع کیا۔ اچانک آواز آئی "قال الشیخ وحید الدین" ایک سکنڈ کے لئے میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس کے بعد ان کا مزید خطبہ سننے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ میری اردو تقریر کا خلاصہ اپنے عربی خطبہ میں پیش کر رہے ہیں۔ یہ میری زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔ ایک صاحب نے کہا کہ یہ واقعہ اس بات کی علامت ہے کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ الرسالہ کی بات کی تائید مساجد کے منبر سے بھی ہونے لگے۔

دوسرا تجربہ اس کے برعکس ۵ جون کی دوپہر کو ہوا۔ اردو گھر میں تقریر تھی۔ عنوان تھا "ایمان کی حقیقت"۔ میں قرآن و حدیث کی روشنی میں ایمان کی حقیقت اور اس کے تقاضوں کو بیان کر رہا تھا کہ اچانک چند نوجوان اسٹیج پر آئے۔ ان کے ہاتھ میں کاغذ پر لکھا ہوا کوئی سوال تھا۔ انھوں نے زور زور سے کہنا شروع کیا کہ پہلے اس کا جواب دو۔ ہم اس وقت تک تقریر ہونے نہیں دیں گے جب تک

ہمارے سوال کا جواب نہ دے دیا جائے۔ مولانا اکبر الدین قاسمی صاحب نے اعلان کیا کہ آپ اپنا سوال صدر جلسہ کو دیدیں۔ تقریر پوری ہونے کے بعد اس کا جواب دیا جائے گا۔ مگر نوجوان مسلسل شور کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ پہلے سوال کا جواب دو، ورنہ ہم تقریر ہونے نہیں دیں گے

یہ نوجوان صرف تین یا چار تھے اور بھرے ہوئے ہال کے تمام لوگوں کو ان سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ لوگ صرف راقم الحروف کی تقریر سننے سے دلچسپی رکھتے تھے۔ چنانچہ سامعین نے چند منٹ میں ان لوگوں کو پکڑ کر باہر کر دیا۔ ایک صاحب نے بعد کو مجھے ایک چھرا دکھایا اور بتایا کہ یہ ان شورش پسند نوجوانوں میں سے ایک شخص کے پاس سے ملا ہے۔ ایک سے زیادہ آدمیوں نے کہا کہ میں ان نوجوانوں کو جانتا ہوں۔ یہ ایک اسلامی تحریک کی "یوتھ ونگ" سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے بعض اصحاب نے کہا کہ پچھلے دن گاندھی بھون میں آپ کا جو اجتماع تھا، اس کی غیر معمولی کامیابی کو دیکھ کر آپ کے مخالفین بوکھلا اٹھے، ان کا یہ اقدام دراصل ان کے احساس شکست کا اظہار تھا جو الرسالہ کے بڑھتے ہوئے مشن کے حق میں زبردست اعتراف کی حیثیت رکھتا ہے۔

آج کل ایک بہت بڑا فتنہ پیدا ہوا ہے۔ یہ وہی ہے جس کو عام طور پر نوجوان دستہ یا یوتھ ونگ (Youth wing) کہا جاتا ہے۔ تمام سیاسی جماعتوں نے ہنگامہ پسند نوجوانوں کو اپنے گرد جمع کر رکھا ہے۔ وہ ہر طرح ان کی سرپرستی کرتی ہیں۔ اور مختلف مواقع پر اپنے مخالفین کو گرانے کے لئے انہیں استعمال کرتی ہیں۔

موجودہ زمانہ کی نام نہاد اسلامی جماعتوں کو پیغمبر کی زندگی میں کوئی اسوہ نہیں ملا۔ البتہ انھوں نے سیاسی جماعتوں کی تقلید میں خود بھی یہی کام شروع کر رکھا ہے۔ یہ جماعتیں مسلم نوجوانوں کو منظم کرتی ہیں تاکہ توڑ پھوڑ اور ہڑبھونگ کا جو کام وہ خود نہیں کر سکتیں، اس کو ان نوجوانوں کے ذریعہ کرائیں۔ یہ نوجوان بظاہر اپنے آپ کو مسلم داعی کہتے ہیں، مگر حقیقۃً وہ مسلم دادا ہیں۔ وہ ہر جگہ صرف ایک کام کر رہے ہیں۔ اسلام کے نام پر تخریب کاری۔ یہ لوگ ہر مسلم ملک میں حکمرانوں کے خلاف وہی شور و غل اور تشدد کر رہے ہیں جو انھوں نے ۲۸ جون کو راقم الحروف کے اجتماع میں کیا۔ فرق صرف یہ ہے کہ میں نے اس ہنگامہ بازی پر صبر کر لیا۔ اور جن لوگوں کے پاس اقتدار ہے وہ ان کے "چھرے" کے

جواب میں ان پر "تلوار" چلا رہے ہیں۔ مختلف ملکوں میں آج اسلامی کام کرنے میں جو رکاوٹیں پیدا ہوگئی ہیں، اس کی ذمہ داری سب سے زیادہ انھیں مسلم نوجوانوں پر ہے جو اسلامی جماعتوں کی سرپرستی میں ہر جگہ خود ساختہ جہاد کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہیں۔ اس کی براہ راست ذمہ داری مسلم نوجوانوں پر ہے اور بالواسطہ ذمہ داری اسلامی جماعتوں پر۔

گاندھی بھون میں جو خطاب (۴ جون) ہوا، اس کا عنوان تھا: اسلام دور جدید کا خالق۔ وسیع ہال، اخباری زبان میں "کھچاکھچ" بھرا ہوا تھا۔ جناب سید مکثر شاہ صاحب اس کے صدر تھے۔ وہ نہ صرف حیدرآباد کی ممتاز شخصیت ہیں، بلکہ ساتھ ہی دینی اور اسلامی مزاج رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ میں بمبئی میں تھا۔ مگر اس عنوان کی کشش کی بنا پر جلدی کرکے حیدرآباد

پروگرام حیدرآباد ، محبوب نگر

تاریخ	مقام	عنوان
۳ جون ۱۹۸۸	جامع مسجد معظم پورہ ، ملے پلی	عنوان : نماز زندگی کا حسن ہے
	مولانا آزاد انسٹی ٹیوٹ ، باغ عامہ	
	زیر صدارت جناب میر اکبر علی خاں صاحب سابق گورنر	دعوت کی تسخیری قوت
۴ جون ۱۹۸۸	مسجد سلطان جہاں بیگم ، مصری گنج	جنت اور جہنم قرآن وحدیث میں
	مسجد سلیمہ خاتون، حمایت نگر	حمد خلاصۂ دین ہے۔
	مسجد عامرہ ، عابد روڈ	اسلام کا عقیدۂ آخرت
	پرکاشم ہال ، گاندھی بھون	
	زیر صدارت جناب سید مکثر شاہ صاحب سابق چیرمین کونسل	اسلام دور جدید کا خالق۔
۵ جون ۱۹۸۸	اردو گھر، مغل پورہ	
	زیر صدارت جناب سید حسن الدین صاحب آئی اے ایس	ایمان باللہ کی حقیقت
	لائبریری مدرسہ سراج العلوم ، محبوب نگر	دینی مدارس کا رول۔
	کریسنٹ پبلک اسکول ، محبوب نگر	
	زیر صدارت : شری رام چندر ریڈی	علم کی اہمیت اسلام میں

واپس آگیا تاکہ آج کی تقریر سن سکوں۔

... رہ سکتا۔ یہ اپنی فطرت سے

اس موضوع پر وہاں جو باتیں کہی گئیں، ان کو مزید اضافہ کے ساتھ مرتب کیا ... احب الرسالہ ہو ہے کہ ان شاء اللہ اس کو الرسالہ کے خصوصی نمبر کے طور پر شائع کر دیا جائے۔

۵ جون کو "اردو گھر" میں اجتماع تھا۔ میں پہنچا تو ہال پوری طرح بھر چکا تھا۔ مجھ کو دیکھتے ہی ایک بزرگ چیخ کر اٹھے اور مجھ سے لپٹ کر رونے لگے۔ وہ کہہ رہے تھے "میرے پیارے تم آگئے، خدا تمھیں بہت دن تک اس کام کے لئے زندہ رکھے۔" اس طرح آج خدا کے فضل سے بے شمار لوگ ہیں جو الرسالہ میں سچائی کی روشنی پا رہے ہیں۔

جناب سید مکثر شاہ صاحب (سابق چیرمین لیجسلیٹو کونسل) نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ میں برابر الرسالہ پڑھتا ہوں اور اس سے پوری طرح متفق ہوں۔ جناب عارف الدین صاحب (مدینہ ٹیکنکل کالج) نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا۔ جناب ایم اے ستار یہاں فرنیچر کا کاروبار کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں مذہبی کتابیں بالکل نہیں پڑھتا تھا۔ مگر جب سے الرسالہ ملا ہے، میرا ذہن بدل گیا ہے۔ میں پابندی سے الرسالہ اور دوسری کتابوں کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ وغیرہ

تاہم بعض لوگ ایسے بھی ملے جن کو الرسالہ سے شکایت تھی۔ انھوں نے کہا کہ الرسالہ میں ہمیشہ مسلمانوں ہی کو نصیحت کی جاتی ہے۔ اس میں اکابر قوم پر تنقیدیں ہوتی ہیں۔

میں نے پہلے ان کو یہ بتلانے کی کوشش کی کہ الرسالہ میں جو بات کہی جاتی ہے وہ قرآن وحدیث کے حوالے سے کہی جاتی ہے۔ اس لئے آپ الرسالہ کی بات کو قرآن وحدیث کے معیار پر جانچیں نہ کہ کسی اور معیار پر۔ جب وہ اس ڈھنگ سے سوچنے کے لئے تیار نہیں ہوئے تو میں نے ان کے سامنے دوسری بات رکھی۔

میں نے کہا کہ دنیا میں دو قسم کے حیوانات ہیں۔ ایک گائے جس کی خوراک گھاس ہے۔ اور دوسرے درندہ جس کی خوراک گوشت ہے۔ آپ درندہ کو گھاس نہیں کھلا سکتے۔ اور اگر آپ گائے کے منہ میں گوشت ڈالیں تو وہ اس کو اگل دے گی۔ یہی معاملہ انسانوں کا ہے۔ انسانوں میں مختلف قسم کے لوگ ہیں اور الرسالہ بہرحال ہر ایک کی غذا نہیں بن سکتا۔

جو لوگ ذاتی فخر میں جیتے ہوں۔ جنھوں نے خدا کے بجائے انسانوں کو اپنا بڑا بنا رکھا ہو۔ جن کی روح

کو اس سے تسکین ملتی ہو کہ وہ اپنی غلطی کے لئے دوسروں کو ذمہ دار ٹھہرائیں۔ جن کو اعتراف کے بجائے سرکشی میں لذت ملتی ہو۔ جو خیالی الفاظ میں لطف لیتے ہوں اور جن کو حقائق سے کوئی دلچسپی نہ ہو، ایسے لوگ الرسالہ سے مختلف مزاج رکھتے ہیں۔ وہ الرسالہ کی باتوں میں اپنی خوراک نہیں پا سکتے۔

الرسالہ صرف سنجیدہ اور حقیقت پسند لوگوں کی غذا ہے۔ اور ہمیں اس پر کوئی شرمندگی نہیں اگر غیر سنجیدہ اور غیر حقیقت پسند لوگ الرسالہ میں اپنی غذا نہ پائیں۔

حیدر آباد میں "باغ عامہ" کی تقریر کے بعد ایک صاحب نے تحریری سوال کیا: "دعوت کا میدان کیا صرف نظریاتی و فکری میدان ہی ہے یا میدان جنگ بھی"۔ میں نے کہا کہ دعوت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ لوگوں کے اوپر تلوار زنی کریں۔ دعوت کا مطلب یہ ہے کہ آپ لوگوں کو اپنے ساتھ جنت کا ہم سفر بنائیں۔ اس قسم کا کام ہمیشہ محبت کے ذریعہ ہوتا ہے نہ کہ نفرت اور تشدد کے ذریعہ۔

جناب احمد بختیار الدین صاحب نے اپنے ذاتی اہتمام کے تحت حیدر آباد کے تین پروگراموں کا ویڈیو کیسٹ تیار کرایا۔ موجودہ زمانہ میں ویڈیو کیسٹ کا طریقہ بہت عام ہو رہا ہے۔ چنانچہ لوگ ہم سے بھی تقاضا کر رہے ہیں کہ جس طرح اس سے پہلے آڈیو کیسٹ تیار کرائے گئے تھے، اسی طرح ویڈیو کیسٹ بھی تیار کرائے جائیں۔

مسجد سلطان جہاں بیگم سے ملا ہوا جناب حسام الدین صاحب کا کارخانہ (پروین پرنٹنگ ورکس) ہے۔ مسجد میں خطاب کے بعد حسام الدین صاحب اپنے کارخانہ میں لے گئے۔ اس کارخانہ میں رنگین ساڑیاں تیار کی جاتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ بُنی ہوئی ساڑی بھیونڈی وغیرہ سے آتی ہے۔ ابتداءً وہ صاف رنگ کی نہیں ہوتی۔ یہاں کارخانہ میں سب سے پہلے اسے سفید بنایا جاتا ہے۔ پھر مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے وہ رنگین چھپی ہوئی ساڑی کے مرحلہ تک پہنچتی ہے۔ یہاں تک کہ تہہ کرکے اس کو پلاسٹک کے تھیلے میں رکھ دیا جاتا ہے تاکہ بازار میں فروخت کے لئے بھیجا جا سکے۔

میں نے پوچھا کہ ابتدا سے آخر تک اس پر کتنے مراحل گزرتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ تقریباً بارہ مرحلے۔ اس سے پہلے کپاس کے مرحلہ سے بُنی ہوئی ساڑی کے مرحلہ تک پہنچنے کے لئے بھی تقریباً اتنے ہی مراحل گزرتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ کپاس سے ساڑی بنانے کے لئے اس کو "۲۴ مرحلوں"

سے گزارنا ہوتا ہے۔ تب وہ اس کپڑے کی صورت اختیار کرتی ہے جو جسم کو ڈھانپنے اور انسان کی تزئین کا ذریعہ بنے۔ مگر موجودہ زمانہ میں ہمارے درمیان ایسے رہنما اٹھے جو "ملت" کو بنانے کے لئے کسی مرحلہ اور تدریج کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ان کا خیال ہے کہ نعرہ لگاؤ اور ملت کی تعمیر کا گنبد اگلے دن کھڑا ہوا نظر آئے گا۔

۵ جون ۱۹۸۸ کو دوپہر بعد حیدرآباد سے محبوب نگر کے لئے روانگی ہوئی۔ راستہ میں ایک جگہ سڑک کے کنارے بورڈ لگا ہوا تھا کہ حفاظت پہلے اور رفتار پیچھے:

Safety first, speed next.

اس کو دیکھ کر خیال آیا کہ آدمی اگر اپنے آپ میں گم ہو جائے تو وہ "اسپیڈ" کو اہمیت دے گا۔ اور اگر وہ جانے کہ سڑک پر وہ تنہا نہیں ہے، بلکہ بہت سے دوسرے لوگ بھی یہاں اپنی اپنی دوڑ لگا رہے ہیں تو وہ "سیفٹی" کو سب سے زیادہ اہم سمجھے گا۔ یہی وسیع تر زندگی کا اصول بھی ہے سڑک کا وہی مسافر حفاظت کے ساتھ اپنی منزل پر پہنچتا ہے جو دوسروں کی رعایت کرتے ہوئے اپنا سفر جاری کرے۔ اسی طرح زندگی میں وہی شخص محفوظ رہ سکتا ہے جو دوسروں کی سرگرمیوں پر نگاہ رکھے اور دوسروں کا لحاظ کرتے ہوئے اپنی زندگی کا سفر طے کرے۔ یہاں دوسرے کو "فرسٹ" بنانا پڑتا ہے اور اپنے آپ کو "نکسٹ"۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوتا ہے کہ آدمی اس دنیا میں اپنی مطلوبہ منزل پر بحفاظت پہنچ سکے۔

محبوب نگر میں دو پروگرام ہوئے۔ یہاں مدرسہ سراج العلوم مولانا امیر اللہ خاں کی زیرنگرانی چل رہا ہے۔ مجھے اس کی لائبریری اور اسٹاف کوارٹرس کا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے بلایا گیا تھا۔ سنگ بنیاد رکھنے سے پہلے ایک جلسہ ہوا جس میں دینی تعلیم اور مدارس عربیہ کی اہمیت پر تقریر کی گئی۔ اس موقع پر میں نے کہا کہ بعض لوگ ناسمجھی کی بنا پر عربی مدارس کا استخفاف کرتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ ان مدارس میں تحفیظ قرآن کا شعبہ رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ پریس کے دور میں قرآن کے لاکھوں نسخے چھپ کر ہر جگہ پھیل چکے ہیں۔ ایسی حالت میں قرآن کا حفظ غیر ضروری ہے۔

میں نے کہا کہ یہ حفاظت بالائے حفاظت کا معاملہ ہے۔ جیسے مولانا آزاد کی کتاب کے تیس صفحے بیک وقت دو جگہ محفوظ کئے گئے ہیں، کلکتہ میں اور دہلی میں۔ تاکہ ایک نسخہ اگر کسی وجہ سے ضائع ہو جائے

تو دوسرا نسخہ موجود رہے۔ قرآن کی کاغذی طباعت کے ساتھ قرآن کی صدری تحفیظ اسی قسم کی ایک تدبیر ہے۔ یہ گویا ایک حفاظت کے اوپر دوسری حفاظت کا اضافہ ہے۔ یہ اہتمام مزید کی ایک صورت ہے جو ہر اہم دستاویز کے ساتھ ہمیشہ اختیار کی جاتی ہے۔

محبوب نگر میں کچھ لوگوں نے کریسنٹ پبلک اسکول (انگلش میڈیم) کھولا ہے۔ ۵ جون کی شام کو اس کی افتتاحی تقریب تھی۔ اس کے صدر شری رام چندر ریڈی ایڈوکیٹ تھے۔ مجھ کو اس موقع پر چیف گیسٹ کے طور پر بلایا گیا تھا۔ میں نے اپنی تقریر میں خاص طور پر یہ بتانے کی کوشش کی کہ اسلام علم کے حصول کو کتنی زیادہ اہمیت دیتا ہے۔

اس سلسلہ میں میں نے تاریخ اسلام کا یہ واقعہ پیش کیا کہ بدر کے قیدیوں کے لئے یہ فدیہ مقرر کیا گیا کہ اگر وہ دس مسلم نوجوانوں کو پڑھا دیں تو انھیں چھوڑ دیا جائے گا۔ یہ قیدی بدترین قسم کے جنگی مجرم تھے۔ ان کو چھوڑنے میں واضح طور پر یہ اندیشہ تھا کہ وہ منظم ہو کر دوبارہ مدینہ پر حملہ کریں گے۔ اور فی الواقع انھوں نے غزوۂ احد کی شکل میں ایسا ہی کیا۔ تاہم اس واضح اندیشہ کے باوجود انھیں تعلیم کی خاطر چھوڑ دیا گیا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں علم کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ ہر خطرہ اور اندیشہ کو نظر انداز کر کے اس کو حاصل کیا جانا چاہئے۔ جب علم اور دوسری مصلحتوں کے درمیان انتخاب کا معاملہ ہو تو علم کا انتخاب کیا جائے نہ کہ دوسری مصلحتوں کا۔

محبوب نگر کے تعلیم یافتہ طبقہ میں الرسالہ کافی پھیل رہا ہے۔ اور اس کا ذریعہ ایجنسی ہے۔ اب خدا کے فضل سے ہر جگہ ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جو ذاتی دلچسپی کے تحت الرسالہ کی ایجنسی چلاتے ہیں اور مخالفین کی مخالفت کے باوجود پورے عزم کے ساتھ اس تعمیری کام پر جمے ہوئے ہیں۔ انھیں میں سے ایک محبوب نگر کے محمد عقیل احمد خاں ہیں۔ وہ ایک باہمت نوجوان ہیں اور مقصدی لگن کے تحت الرسالہ (اردو، انگریزی) کی ایجنسی نہایت باقاعدگی کے ساتھ چلا رہے ہیں۔

اس قسم کے لوگ بلاشبہ الرسالہ کا سب سے قیمتی سرمایہ ہیں۔ میں نے ایک مجلس میں کہا کہ جس شخص نے الرسالہ کو ایک بار پڑھا اس نے الرسالہ کو نہیں پڑھا، جس نے الرسالہ کو دوبار پڑھا اس نے الرسالہ کو پڑھا۔ اسی طرح جو شخص زبانی طور پر الرسالہ سے اتفاق کرے اس نے الرسالہ سے اتفاق نہیں کیا، الرسالہ سے اتفاق کرنے والا وہ ہے جو الرسالہ کی ایجنسی لے کر اس کو لوگوں کے درمیان

پھیلائے۔ الرسالہ ایک مشن ہے، اور مشن سے اتفاق کبھی جامد ہو کر نہیں رہ سکتا۔ یہ اپنی فطرت کے اعتبار سے ایک توسیعی جذبہ ہے۔ جو اتفاق توسیع نہ بنے وہ اتفاق نہیں۔ جو شخص صاحبِ الرسالہ ہو مگر وہ صاحبِ ایجنسی نہ بنے، وہ صاحبِ الرسالہ بھی نہیں۔

۶ جون کی صبح کو انڈین ایئر لائنز کی فلائٹ نمبر ۱۲۰ کے ذریعہ حیدرآباد سے بمبئی کے لئے روانگی ہوئی۔ یہ ایک گھنٹہ اور کچھ منٹ کا سفر تھا۔ اپنے بھتیجے اظفر میاں کے ساتھ ایئر پورٹ سے سیدھا ہندوجا اسپتال پہنچا جہاں میرے بڑے بھائی عبد العزیز خاں صاحب زیر علاج تھے۔ ان کو ۲۳ مئی کو برین ہیمورنج کا حملہ ہوا۔ اس کے بعد وہ مسلسل بے ہوشی (کوما) میں رہے۔ یہاں تک کہ ۷ جون ۱۹۸۸ کی شام کو ان کا انتقال ہو گیا۔

اسپتال میں آئی سی یو (ICU) کے کمرہ نمبر ۱۴ میں داخل ہوا تو وہاں وہ شخصیت اسپتال کے مخصوص بیڈ پر لیٹی تھی جس کی عیادت کے لئے میں یہاں آیا تھا۔ میں بھائی صاحب کو دیکھ رہا تھا، مگر میں ان سے ربط قائم نہیں کر سکتا تھا۔ کیوں کہ اس وقت ان کے دیکھنے اور بولنے اور سننے کی صلاحیت معطل ہو چکی تھی۔ وہ نہ مجھ کو دیکھ رہے تھے، نہ میرے سلام کا جواب دے سکتے تھے، نہ کسی قسم کی گفتگو ان کے ساتھ ممکن تھی۔ اس وقت وہ مجھ سے دور، مگر اپنے رب سے قریب تھے ——— یہ لمحہ جاننے والوں کے اوپر جیتے جی آ جاتا ہے اور نہ جاننے والوں کے اوپر اس وقت آتا ہے جب کہ وہ موت کے دروازے پر پہنچ چکے ہوں: ونحن اقرب الیہ منکم ولکن لا تبصرون (الواقعہ ۸۵)

عبد العزیز خاں صاحب اعظم گڈھ میں غالباً ۱۹۱۹ میں پیدا ہوئے۔ وہ غیر معمولی خصوصیات کے آدمی تھے اور انھوں نے معاشی میدان میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۴۲ میں انھوں نے اعظم گڈھ میں بزنس شروع کیا۔ ۱۹۷۰ میں لائٹ اینڈ کمپنی پرائیویٹ لمیٹڈ قائم کی جس کا صدر دفتر الٰہ آباد تھا۔ ۱۹۸۱ میں وہ خود بھی الٰہ آباد منتقل ہو گئے۔ وہ لائٹ اینڈ کمپنی کے چیرمین تھے۔ اس کمپنی نے اپنی غیر معمولی کارکردگی کی بنا پر کئی بڑے بڑے انعامات حاصل کئے ہیں۔ اس کا کام ہے زیادہ طاقت کی بجلی کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے والے بڑے بڑے کھمبوں کی تنصیب:

Erection of extra high voltage transmission lines.

میری زندگی اور میرے مشن سے بھائی صاحب مرحوم کا نہایت گہرا تعلق تھا۔ میرے والد

(فریدالدین خاں مرحوم) کا انتقال ہوا تو اس وقت میری عمر تقریباً ۵ سال تھی۔ چنانچہ میرے بڑے بھائی ہی تمام عمر میرے سرپرست رہے۔ ہر آدمی جب بڑا ہوتا ہے تو اس کو معاشی جدوجہد میں لگنا پڑتا ہے۔ اپنے مزاج کی بنا پر میں نے اس کے برعکس یہ خطرناک راستہ اختیار کیا کہ میں نے حصول معاش کے بجائے حصول علم کو اپنا نشانہ بنایا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد لمبا عرصہ ایسا گزرا ہے جب کہ میری ساری توجہ تلاش حق، قرآن و حدیث کا مطالعہ اور دوسرے علوم کی تحقیق میں لگی رہی۔ معروف معنوں میں میں نے کمانے کا کوئی کام نہیں کیا۔

یہ طویل غیر معاشی زندگی زبردست معاشی قیمت مانگتی تھی۔ اس کو مسلسل جاری رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ کوئی شخص ہو جو میرے معاشی بوجھ کو اٹھالے، جو میری علمی جدوجہد میں میرا عملی بدل بن جائے۔ میرے بڑے بھائی نے یہ مشکل قیمت ادا کی۔ وہ مسلسل پچاس سال تک میرے سرپرست بنے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں تلاش و تحقیق اور مطالعہ و تجربہ کی طویل اور دشوار مہم کو اس کی آخری منزل تک پہنچانے میں کامیاب ہوا۔ اگر عبدالعزیز خاں صاحب مرحوم میرا معاشی بوجھ نہ اٹھاتے تو شاید میں، بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح، صرف ایک حیوانِ کاسب بن کر رہ جاتا، میں کبھی انکشاف حق کی منزل تک نہ پہنچتا۔

موجودہ دنیا میں کامیاب بننے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی دوسروں کے ساتھ مصالحت اور موافقت کی روش اختیار کرے۔ غیر مصالحانہ رویہ (Uncompromising attitude) کسی انسان کے لئے سب سے بڑا قاتل ہے۔ میں اپنے مخصوص مزاج کی بنا پر کسی بھی شخصیت یا کسی بھی گروہ یا حلقہ کے ساتھ مصالحانہ انداز اختیار نہ کر سکا۔ میں نے ہمیشہ سچائی کا لحاظ کیا نہ کہ شخصیتوں اور جماعتوں کا۔

بلاشبہ یہ ایک بے حد خطرناک معاملہ تھا۔ ہر ایک کے ساتھ غیر مصالحانہ روش اختیار کرنے کے بعد میرا زندہ رہنا بھی مشکل تھا، کجا کہ میں کوئی مشن کھڑا کر سکوں۔ خود بھائی صاحب مرحوم کو، تمام تر برادرانہ محبت کے باوجود، اس معاملہ میں مجھ سے شکایت رہی۔ تاہم شکایت اور اختلاف کے باوجود انھوں نے کامل طور پر میری سرپرستی کی۔ اور میرا پورا بوجھ مسلسل اٹھاتے رہے۔

غیر مصالحانہ روش موجودہ امتحان کی دنیا میں اتنا بڑا جوکھم ہے جس کا تحمل کرنے کے لئے پہاڑ جیسی طاقت ور شخصیت درکار ہے۔ میرے جیسا عاجز اور کمزور آدمی ایک دن کے لئے بھی اس امتحان

کو برداشت نہیں کرسکتا۔ تاہم یہ صرف بھائی صاحب مرحوم کی مسلسل سرپرستی تھی جس کی بنا پر میں اس انتہائی مشکل اور خطرناک وادی کو پار کرنے میں کامیاب ہو سکا۔

۱۹۷۶ میں ماہنامہ الرسالہ جاری ہوا تو اس کا تمام ضروری سرمایہ بھائی صاحب مرحوم نے فراہم کیا۔ اس کے علاوہ مختلف مواقع پر وہ برابر میری مدد کرتے رہتے تھے۔ الرسالہ اور اسلامی مرکز کی صورت میں جو ڈھانچہ آج موجود ہے، وہ حقیقت کے اعتبار سے بلاشبہ اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے۔ مگر ظاہری اسباب کے اعتبار سے وہ سب کا سب، براہ راست یا بالواسطہ طور پر، بھائی صاحب مرحوم کی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ اپنی معلومات کے مطابق، ماضی یا حال میں مجھے کوئی بھی دوسرا بھائی نہیں معلوم جس نے اپنے بھائی کی اتنی زیادہ مدد کی ہو جتنی عبد العزیز خاں صاحب نے میری کی۔ ان کی وفات ایک طرف میرے بھائی کی وفات تھی، دوسری طرف میں نے عالم اسباب میں اپنے قیمتی سرپرست کو کھو دیا۔ اللہ تعالیٰ بھائی صاحب مرحوم پر رحمتیں نازل فرمائے، اور میرا مددگار ہو۔ وہی ہر ایک کی مدد کرنے والا ہے۔

۷ جون کی صبح کو اچانک بھائی صاحب مرحوم کے دل کی حرکت بند ہو گئی۔ تاہم بجلی کا شاک دینے سے چند منٹ بعد دل کی حرکت دوبارہ جاری ہو گئی۔ اس دوران نلکی کے ذریعہ ان کے اندر آکسیجن پہنچایا جاتا رہا۔ یہ حالت تقریباً ۱۲ گھنٹے رہی۔ اس کے بعد ۷ جون کی شام کو ساڑھے نو بجے ڈاکٹروں نے اعلان کیا کہ مریض کی وفات ہو چکی ہے۔ آخری ہچکی کے وقت ان کے صاحبزادہ جمیل احمد خاں انجنیئر ان کے پاس موجود تھے۔

موجودہ زمانہ میں ایک نئی سائنس وجود میں آئی ہے جس کو کرائیوجینکس (Cryogenics) کہتے ہیں۔ یعنی زندگی سے تعلق رکھنے والی چیزوں کو کم ٹمپریچر پر رکھ کر انھیں محفوظ کرنا۔ اس سائنس کی ابتدا ۱۸۷۷ میں ہوئی۔ اس کے ذریعہ پودے، غذائیں، اجزاء بدن مثلاً گردہ وغیرہ کو محفوظ کرنے میں کامیابی حاصل کی جا چکی ہے۔ مگر پورے انسانی جسم کو موت کے بعد ایک لمبی مدت تک محفوظ رکھنا ابھی تک ایک ناممکن چیز سمجھا جاتا ہے:

The prolonged viable preservation of whole animals, especially man, is now considered impossible, due to the complex and varied nature of the body (EB-5/322).

تاہم امریکہ میں ایسے ادارے کھل گئے ہیں جو بڑی بڑی فیس لے کر مردہ جسموں کو خاص طرح کے "کولڈ اسٹورتیج" میں محفوظ رکھتے ہیں۔ جو دولت مند لوگ ایسی بیماریوں میں مرتے ہیں جن کا علاج ابھی تک دریافت نہ ہو سکا (مثلاً کینسر) ان کی وصیت کے تحت ان کے جسموں کو مذکورہ قسم کے سرد خانوں میں محفوظ کر دیا جاتا ہے، اس امید میں کہ شاید کبھی ان بیماریوں کا علاج دریافت ہو اور انھیں دوبارہ زندہ کیا جا سکے ــــــ انسان ابدی زندگی چاہتا ہے، مگر آخرت کا تصور سامنے نہ ہونے کی وجہ سے وہ غلط طور پر موجودہ فانی دنیا میں غیر فانی زندگی کی تلاش کر رہا ہے۔

جون کی آٹھ تاریخ ہے اور صبح ۹ بجے کا وقت۔ کوئنزرا یا رٹمنٹ (پالی ہل) کے نیچے بھائی صاحب کا جسم سفید کپڑوں میں لپٹا ہوا رکھا ہے۔ میں اس کو دیکھ رہا ہوں۔ میرے ذہن میں یادوں کی ریل چل رہی ہے۔ ایک زندگی جو ۱۹۱۹ میں شروع ہوئی اور ۱۹۸۸ میں ختم ہوگئی۔ یہی ہر ایک کے ساتھ پیش آنے والا ہے اور یہی خود میرے ساتھ بھی پیش آئے گا۔ موجودہ جسم انسانی روح کا دنیوی مکان ہے۔ موت وہ لمحہ ہے جب کہ روح اپنے دنیوی مکان کو چھوڑ کر ایک اور جسم میں داخل ہو جاتی ہے جو اس کا اخروی مکان ہے۔

بھائی صاحب کے مردہ جسم کو دیکھ کر مجھے خود اپنی موت یاد آگئی۔ ایک لمحہ کے لئے ایسا محسوس ہوا گویا خود میرا جسم کفن میں لپٹا ہوا پڑا ہے۔ یہ سوچ کر دل بے قرار ہو گیا۔ میں نے کہا کہ خدایا، مجھے بلا حساب بخش دیجئے۔ کیوں کہ میرا عمل بھی اتنا ہی بے عمل ہے جتنا کہ میری بے عملی۔

ڈاکٹر عبد الکریم نائک (پیدائش ۱۹۲۸) نفسیات کے ماہر ہیں۔ بمبئی کے سفر میں میرا قیام انھیں کے یہاں تھا۔ ۷ جون ۱۹۸۸ کو ہم لوگ نماز فجر سے فراغت کے بعد قریب کی مجگاؤں ہل پر ٹہلنے کے لئے گئے۔ یہ ایک پرفضا جگہ ہے۔ اس کے آس پاس زیادہ تر مسلمانوں کی آبادیاں ہیں۔ مگر وہاں جو لوگ ورزش یا چہل قدمی کرتے ہوئے نظر آئے وہ سب غیر مسلم تھے۔ ہم تین آدمیوں کے سوا وہاں اس وقت غالباً کوئی مسلمان موجود نہ تھا۔

یہ ایک پہاڑی تفریح گاہ ہے۔ سامنے دور تک سمندر کا منظر پھیلا ہوا ہے۔ یہاں ہم لوگ پارک میں کچھ دیر کے لئے بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر نائک صاحب نے گفتگو کرتے ہوئے کہا: میرے نزدیک انسانی مسائل کا حل انصاف میں نہیں صلح میں ہے۔ کیوں کہ موجودہ دنیا میں اکثر حالات میں انصاف ممکن

نہیں ہوتا، جب کہ صلح ہر وقت ممکن ہوتی ہے۔

انھوں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ ہمارے آبائی وطن (رتنا گیری) میں ایک زمین پر دو آدمیوں کا جھگڑا تھا۔ ایک شخص نے زمین پر قبضہ کر رکھا تھا۔ دوسرا شخص جو اپنے آپ کو اس زمین کا مالک بتاتا تھا، اس کا مطالبہ تھا کہ قابض شخص مجھ کو آٹھ ہزار روپے دے، تب میں اپنے حق سے دستبردار ہوں گا۔ دوسرا شخص اس پر راضی نہ تھا۔ پہلے شخص کا کہنا تھا کہ میں آٹھ ہزار روپے سے ایک پیسہ کم نہیں لوں گا۔ دوسرے کا کہنا تھا کہ میں چھ ہزار سے ایک پیسہ زیادہ نہیں دوں گا۔

ڈاکٹر نائک صاحب کو معلوم ہوا تو انھوں نے کہا کہ میں چند منٹ میں اس مسئلہ کو حل کرتا ہوں۔ انھوں نے دونوں کو بلایا اور دونوں سے بات کی۔ دونوں نے وہی بات کہی جو وہ پہلے کہہ چکے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ تمہارا مطالبہ آٹھ ہزار روپے کا ہے۔ اس نے کہا کہ ہاں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ ٹھیک ہے، تم کو آٹھ ہزار روپیہ مل جائے گا۔ اس کے بعد انھوں نے دوسرے شخص سے کہا کہ تم اپنے قول کے مطابق چھ ہزار روپے لے آؤ۔ وہ لے آیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی طرف سے دو ہزار روپیہ شامل کرتے ہوئے کہا کہ یہ آٹھ ہزار روپیہ لو اور جھگڑا ختم کرو۔ ڈاکٹر صاحب نے جب ایسا کیا تو مالک زمین کو شرم آگئی۔ وہ اپنا مطالبہ واپس لیتے ہوئے چھ ہزار روپیہ پر راضی ہو گیا۔

ہر مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ مسئلہ کو حل کرنے کے لئے وہ طریقہ اختیار کیا جائے جو دل کو نرم کرنے والا ہے۔ وہ طریقہ اختیار نہ کیا جائے جو دل کے اندر سوئے ہوئے منفی جذبات کو بھڑکا دیتا ہے اور عداوت کا طوفان برپا کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے الفاظ میں اس دنیا میں مسئلہ کا یقینی حل صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے انصاف کا مطالبہ کرنے کے بجائے صلح پر راضی ہو جانا۔

مسٹر شکیل احمد خاں انجینیر سے بمبئی میں ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۹۷۸ میں وہ الہ آباد میں تھے۔ ایک روز صبح کو اچانک انھیں معلوم ہوا کہ ان کے مکان کے پچھلے حصہ میں خنزیر کاٹ کر ڈالا ہوا ہے۔ یہ خبر تیزی سے پھیل گئی اور بستی میں اشتعال پیدا ہونے لگا۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت اگر میں ذرا بھی ہوش مندی کے خلاف کرتا تو الہ آباد میں فساد ہو جاتا۔ مگر میں نے فوراً پولیس افسر کو ٹیلی فون کیا۔ اس کے بعد پانچ منٹ میں پولیس اپنی گاڑی لے کر آگئی۔ وہ خنزیر کو اٹھا لے گئی اور جگہ کو پوری طرح صاف کرا دیا۔ پولیس نے مجھ سے نام پوچھا۔ مگر میں نے کسی کا نام نہیں بتایا۔

میں نے کہا کہ ہر فساد ہمیشہ جوابی غلطی سے ہوتا ہے۔ اگر ایک غلطی کے بعد دوسری غلطی نہ کی جائے تو ہمیشہ کے لئے فساد کی جڑ کٹ جائے گی۔ خنجر بر کاٹ کر ڈالنا پہلی غلطی تھی۔ اب اگر مسٹر شکیل احمد شور وغل کرتے تو یہ دوسری غلطی ہوتی مگر انھوں نے چوں کہ دوسری غلطی نہیں کی، اس لئے فساد کی صورت پیدا ہونے کے باوجود فساد نہیں ہوا۔

اخبار کی اطلاع سے پونہ کے احباب کو میری بمبئی آمد کی خبر ہو گئی تھی۔ چنانچہ وہاں سے کچھ لوگ بمبئی آگئے۔ ان سے ملاقات اور گفتگو رہی۔ یہ لوگ ۷ جون کی تقریر میں شریک رہے۔ بمبئی کے بعض اخباروں کے نمائندے انٹرویو لینا چاہتے تھے۔ ایک ہندی اخبار کے نمائندے کو وقت بھی دیا جا چکا تھا۔ مگر بھائی صاحب کے انتقال کی وجہ سے پروگرام کی ترتیب باقی نہ رہ سکی۔ انٹرویو اور بعض دوسرے پروگرام منسوخ کر دینے پڑے۔

بمبئی میں عام ملاقاتوں کے علاوہ تین اجتماعی خطاب ہوئے۔ دو خطاب جیسمین اپارٹمنٹ کی مسجد میں، اور ایک ڈاکٹر عبد الکریم نائک صاحب کی رہائش گاہ پر۔ مسجد کے دونوں خطابات کا موضوع آخرت تھا، تیسرا خطاب دعوت کے موضوع پر تھا۔ تینوں تقریروں کا ٹیپ بمبئی کے احباب کے پاس موجود ہے۔

بمبئی کے آخری خطاب میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ اس اعتراض کا جواب دیا گیا کہ "الرسالہ مسلمانوں کو اقدام سے روکتا ہے اور پسپائی کا سبق دیتا ہے۔" میں نے بتایا کہ یہ ایک خود ساختہ الزام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم میں اور دوسروں میں جو فرق ہے وہ یہ نہیں ہے کہ دوسرے لوگ اقدام کا راستہ دکھا رہے ہیں۔ اور ہم انھیں پسپائی کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ اصل فرق اقدام کے میدان کے بارہ میں ہے نہ کہ نفس اقدام کے بارہ میں۔ دوسرے لوگ ٹکراؤ کے میدان میں اقدام کا سبق دے رہے ہیں، اور ہم مسلمانوں کو دعوت کے میدان میں اقدام کی طرف بلاتے ہیں۔ قرآن وحدیث سے، نیز تاریخی واقعات سے اس کی وضاحت کی گئی۔

۸ جون ۱۹۸۸ کی شام کو انڈین ایر لائنز کی فلائٹ نمبر ۱۸۳ کے ذریعہ بمبئی سے دہلی کے لئے واپسی ہوئی۔ بھائی صاحب مرحوم تین ہفتے سے بمبئی میں تھے۔ میرے وہاں پہنچنے کے بعد اگلے ہی دن ان کی وفات ہو گئی تو ایسا معلوم ہوا جیسے اللہ تعالیٰ نے دونوں تاریخیں ایک ساتھ مقرر کر دی ہوں۔

ایک طرف بھائی صاحب اپنی آخرت کی منزل کی طرف روانہ ہوئے، دوسری طرف میں ان کا آخری دیدار کرکے اپنی دنیوی منزل (دہلی) کے لئے روانہ ہوا۔ کیسی عجیب ہے یہ جدائی، اور کیسی عجیب ہوگی وہ ملاقات جو دوبارہ آخرت کی دنیا میں تمام لوگوں کی ایک دوسرے کے ساتھ ہوگی۔

دہلی پہنچنے کے بعد الرسالہ اکیڈمی حیدرآباد کا خط ملا کہ اجتماعات کے موقع پر حیدرآباد میں جو اسٹال لگائے گئے تھے وہاں سے لوگوں نے بڑی تعداد میں کتابیں حاصل کیں۔ نیز الرسالہ کے خریداروں کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا۔ چنانچہ انھوں نے کتابوں کے مزید آرڈر کے ساتھ لکھا تھا کہ تازہ الرسالہ (جون ۱۹۸۸) کے مزید ۲۵ نسخے فوراً روانہ کئے جائیں۔ تاکہ نئے شائقین کو فراہم کیا جاسکے ——— جو لوگ الرسالہ کے مشن کو بدنام کرنے کی مہم چلا رہے ہیں، انھیں جاننا چاہئے کہ الرسالہ ایک فکری سیلاب ہے، اور جو چیز فکری سیلاب ہو اس کو جھوٹے الفاظ کے تنکوں سے روکا نہیں جاسکتا۔

بیماری سے اکتاکر

امریکہ کے طبی جرنل (American Journal of Medicine) میں ایک ڈاکٹر کا خط چھپا ہے۔ ڈاکٹر نے اپنا نام ظاہر کیے بغیر اپنی ایک مریضہ کی تفصیلات درج کی ہیں جو مسلسل بیماری کے نتیجہ میں زندگی سے تنگ آچکی تھی اور علاج کی تمام کوششیں اس کو دوبارہ تندرستی عطا کرنے میں ناکام ثابت ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر نے لکھا ہے کہ آخر کار اس نے اپنی اس خاتون مریض کو، جو کہ سرطان کی بیماری میں مبتلا تھی، ہمیشہ کی نیند سلا دیا تاکہ اس کی مصیبت کا خاتمہ کیا جا سکے :

He put a patient suffering from terminal cancer
to sleep forever to end her misery.

اس واقعہ کو مسٹر راجندر پربھو (مقیم واشنگٹن) نے اپنے ایک مضمون میں نقل کیا ہے جو ہندستان ٹائمس (۷ اپریل ۱۹۸۸) میں شائع ہوا ہے، اور اس کا عنوان ہے علمی انفجار (Knowledge explosion)۔

انسان موت کو زندگی کا خاتمہ سمجھتا ہے۔ حالاں کہ موت، حدیث کے الفاظ میں، عرض اکبر کا دن ہے۔ یہ وہ فیصلہ کن لمحہ ہے جب کہ انسان اپنے امتحان کی مدت پوری کر کے نتیجہ پانے کے مرحلہ میں داخلہ ہو جاتا ہے۔ یہ خالق و مالک کے سامنے بندے کی حاضری ہے۔ یہ عارضی زندگی سے ابدی زندگی کی طرف منتقل ہونا ہے۔

بیماری بلاشبہ ایک مصیبت کا واقعہ ہے۔ لیکن اگر زندگی کی اصل حقیقت کے اعتبار سے دیکھئے تو وہ ایک رحمت ہے۔ بیماری آدمی کو یاد دلاتی ہے کہ اس کا آخری وقت قریب آگیا ہے۔ وہ غافل آدمی کو چوکنا کرنے والی ہے۔ وہ ایک قدرتی الارم ہے جو سوتے آدمی کو جگا دیتا ہے تاکہ وہ آنے والے دن کے لیے پیشگی طور پر تیار ہو جائے۔ بیماری ایک چیتاونی ہے، مگر نادان آدمی اس کو مصیبت سمجھنے کی بنا پر عین اسی سبق سے محروم ہو جاتا ہے جس کے لیے اس کو بیماری میں مبتلا کیا گیا تھا۔

۱۔ نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا کی طرف سے ہمیں ایک کتابچہ موصول ہوا ہے جس کا نام ہے (Books from India) اس میں بتایا گیا ہے کہ صوفیا (بلغاریہ) کی ۱۸ ویں انٹرنیشنل بک فیر ۲ جون سے ۷ جون ۱۹۸۸ تک ہوئی۔ اس موقع پر نیشنل بک ٹرسٹ کی طرف سے مختلف موضوعات پر تین سو انگلش کتابیں نمائش اور تعارف کے لیے رکھی گئیں۔ ان کتابوں میں مرکز کی حسب ذیل چار کتابیں بھی شامل تھیں:

God Arises, Muhammad: The Prophet of Revolution, Religion and Science, Tabligh Movement.

۲۔ وائس آف القرآن (حیدرآباد) نے اپنے خط (۱۲ مئی ۱۹۸۸) میں اطلاع دی ہے کہ انھوں نے الرسالہ اپریل ۱۹۸۸ کے صفحۂ اول کے مضمون کی جلی کتابت کرواکر اس کا اسٹیکر تیار کرایا اور اس کو شہر کے مختلف مقامات پر لگوایا۔ یہ طریقہ دوسرے لوگ بھی اختیار کر سکتے ہیں۔

۳۔ خدا کے فضل سے الرسالہ کا فکر مختلف شکلوں میں تیزی سے پھیل رہا ہے۔ مثلاً بمبئی کا ماہنامہ نقش کوکن ہر ماہ الرسالہ کے بعض مضامین کو اہتمام کے ساتھ شائع کرتا ہے۔

۴۔ بمبئی کے روزنامہ انقلاب نے ایک مستقل سلسلہ شروع کیا ہے۔ وہ اپنے "تبصرے" کے کالم میں الرسالہ کے ہر شمارہ کا تذکرہ اور تعارف شائع کرتا ہے۔ الرسالہ کے ہر شمارہ کی بعض باتوں کو لے کر لوگوں کو اس کی خصوصیات کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔ یہ ایک بے حد مفید سلسلہ ہے۔ انشاء اللہ اس سے الرسالہ کی توسیع اشاعت میں مزید مدد ملے گی۔

۵۔ سورت سے ایک گجراتی ماہنامہ "حیات" کے نام سے شائع ہوتا ہے۔ یہ ماہنامہ الرسالہ کے مضامین کا گجراتی ترجمہ اپنے صفحات میں شائع کر رہا ہے۔ اسی طرح دوسرے بہت سے جرائد الرسالہ کے مضامین کو بلا حوالہ اپنے کالموں میں نقل کرتے ہیں۔ یہ لوگ بھی کم از کم فکری طور پر الرسالہ کے پیغام کی اہمیت کا اعتراف کر رہے ہیں۔

۶۔ ایک صاحب لکھتے ہیں: ایک قاری الرسالہ کو جون کا الرسالہ دینے کے لیے گیا۔ وہاں ان

کے دو دوست بھی تھے وہ میرے لیے بالکل اجنبی تھے اور الرسالہ کے لیے بھی اجنبی۔ وہ الرسالہ کو دیکھ کر بولے یہ کون سا پرچہ ہے۔ میں نے اس کا مختصر تعارف کروایا اور یہ کہا کہ یہ عام نوعیت کا پرچہ نہیں ہے بلکہ اس پرچہ میں ایک خصوصیت ہے وہ یہ کہ اس میں تقریباً ایک ایک صفحہ کے مضامین ہوتے ہیں جس کو ہر شخص شوق سے اور جلدی پڑھ لیتا ہے۔ یہ کہتے ہوئے ان کو صفحہ نمبر ۴ کا مضمون "حد کو پار نہ کیجئے" نکال کر دیا کہ اس کو پڑھیے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ انھوں نے پڑھا اور الرسالہ کے مستقل قاریوں میں اپنا نام لکھوا دیا (محمد وحید الدین، حیدرآباد)

۷۔ الرسالہ ۱۹۷۶ سے یہ مہم چلا رہا ہے کہ مسلمان احتجاج اور مطالبہ کا طریقہ چھوڑیں اور مثبت انداز اختیار کریں۔ خدا کے فضل سے اب اس کے اثرات ظاہر ہونا شروع ہو گیے ہیں۔ اخبار ہجوم (۲۹ اپریل - ۵ مئی ۱۹۸۸) نے ایک مشہور جماعت کے اجلاس کی رپورٹ شائع کی ہے جس کا عنوان ہے "مطالباتی سیاست کے گھروندے سے نکلنے کی کوشش" رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ صدر صاحب نے "واضح طور پر کہا کہ ہماری جماعت اب تک مطالباتی سیاست پر عمل کر رہی تھی۔۔۔۔۔ انھوں نے تالیوں کی گونج میں کہا کہ اب ہم پٹری بدل رہے ہیں اور مطالباتی سیاست کے گھروندے سے نکل رہے ہیں۔ اب ہم مانگنے کے بجائے یہ تلاش و جستجو کر رہے ہیں کہ اسلام اپنے دامن میں ملک کے انسانوں کو دینے کے لیے کیا رکھتا ہے" الرسالہ کی مہم اللہ کے فضل سے اس حد تک موثر ہوئی ہے کہ اب کچھ لوگ اعلان کے ساتھ اپنی پٹری بدل رہے ہیں اور کچھ لوگ اعلان کے بغیر۔

۸۔ جون ۱۹۸۸ کے پہلے ہفتہ میں صدر اسلامی مرکز نے حیدرآباد، محبوب نگر اور بمبئی کا دورہ کیا تینوں مقامات پر ملاقاتوں اور خطابات کے پروگرام ہوئے۔ تفصیلی روداد انشاء اللہ سفرنامہ کے ساتھ شائع ہوگی۔

۹۔ ڈاکٹر تھیوڈور رائٹ (Dr. Theodore P. Wright Jr.) امریکہ کی اسٹیٹ یونیورسٹی آف نیویارک میں پولٹیکل سائنس کے پروفیسر ہیں۔ انھوں نے مسلم اقلیت کے موضوعات پر کئی مقالے لکھے ہیں۔ صدر اسلامی مرکز کا مقالہ جو ہندستانی مسلمانوں کے بارہ میں ٹائمس آف

انڈیا میں چھپا تھا، اس کی نقل مساچوسٹس کی انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی لائبریری کی طرف سے ڈاکٹر رائٹ کو بھیجی گئی تھی۔ اس کو دیکھنے کے بعد ڈاکٹر رائٹ نے ایک خط (۳ مئی ۱۹۸۸) صدر اسلامی مرکز کو بھیجا ہے اور الرسالہ انگریزی اور دوسری انگریزی کتابوں کو پڑھنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خدا کے فضل سے الرسالہ کی آواز کس طرح مختلف ذرائع سے پھیل کر دور دور تک پہونچ رہی ہے۔

۱۰۔ ایک مقام کے بارہ میں معلوم ہوا کہ وہاں فرقہ وارانہ فساد کی صورت پیدا ہوگئی۔ ایک فرقہ جلوس کی صورت میں سڑک سے گزرتا ہوا دوسرے فرقہ کے محلّہ میں پہونچا اور نامناسب نعرے لگانے لگا۔ اب دوسرے فرقہ کے لوگ مشتعل ہو کر چھتوں پر چڑھ گیے اور سنگباری کی صورت میں جواب دینا چاہتے تھے۔ اس موقع پر الرسالہ کے چند قاری سامنے آ گیے۔ انھوں نے اپنے فرقہ کے لوگوں کو سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا۔ انھوں نے کہا کہ اگر تم پتھر مارو گے تو مسئلہ تمہارا اور پولس کا بن جائے گا۔ لیکن اگر تم خاموش ہو جاؤ تو مسئلہ پولس کا اور جلوس والوں کا رہے گا۔ ان کی کوشش کامیاب ہوگئی اور لوگ چھتوں سے اتر گیے۔ اس کے بعد مسئلہ واقعۃً پولس کا اور جلوس کا بن گیا۔ پولس نے جلوس سے آگے بڑھنے کے لیے کہا، جب وہ آگے نہیں بڑھے تو پولس نے لاٹھی چارج کر کے جلوس والوں کو منتشر کیا —— الرسالہ کے قارئین کو اسی طرح نازک مواقع پر سامنے آنا چاہیے اور الرسالہ کے اسلامی فکر کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کرنا چاہیے۔

۱۱۔ ایک صاحب نے کہا کہ الرسالہ کی ایک بہت انوکھی صفت ہے جو موجودہ زمانہ میں شاید ہی کسی پرچہ کو حاصل ہو۔ وہ یہ کہ الرسالہ جس کے ہاتھ میں پہونچ جاتا ہے وہ اس کو شروع سے آخر تک پڑھتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج کل انگریزی پرچہ India Today ٹاپ کا پرچہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر سروے سے پتہ چلا ہے کہ انڈیا ٹوڈے کے خریدار بمشکل اس کا ۱۵ فی صد حصہ پڑھتے ہیں۔ جب کہ الرسالہ کے جتنے قاری میں نے دیکھے سب کا یہ حال ہے کہ وہ اس کو پورا کا پورا پڑھتے ہیں۔ بلکہ بہت سے تو ایک رسالہ کو ایک سے زیادہ بار پڑھتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے الرسالہ کو یہ مقبولیت عطا فرمائی۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱- الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم ازکم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲- زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳- کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴- صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵- ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط وکتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے	
ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے رابی آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی-۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

Delhi Postal Regd. No. D(SE) 243 RN 28822/76 August 1988 No 141

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدّین خاں کے قلم سے

	Rs
تذکیر القرآن جلد اول	100/-
” ” جلد دوم	100/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبر انقلاب	30/-
مذہب اور جدید چیلنج	35/-
عظمتِ قرآن	25/-
الاسلام	25/-
ظہورِ اسلام	25/-
اسلامی زندگی	20/-
احیاءِ اسلام	20/-
رازِ حیات (مجلد)	45/-
صراطِ مستقیم	25/-
خاتونِ اسلام	35/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
اسلام اور عصرِ حاضر	20/-
حقیقتِ حج	25/-
اسلامی تعلیمات	20/-
تبلیغی تحریک	15/-
تعبیر کی غلطی	35/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-

دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدیدِ دین	4/-
اسلام دینِ فطرت	4/-
تعمیرِ ملّت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	8/-
عقلیاتِ اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	3/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	3/-
تعارفِ اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-
ایمانی طاقت	4/-
اتحادِ ملّت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	6/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
آخری سفر	4/-

اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیاتِ طیبہ	4/-
باغِ جنّت	4/-
نارِ جہنّم	4/-
میوات کا سفر	25/-

God Arises	Rs. 45/-
Muhammad The Prophet of Revolution	50/-
Religion and Science	25/-
Tabligh Movement	20/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad The Ideal Character	4/-
Man Know Thyself !	4/-
इन्सान अपने आपको पहचान	2/-
सच्चाई की तलाश	4/-

مکتبہ الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی